سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر ۱

جوہرِ زندگان

تصنیف

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ

جسے

رازق الخیری ایڈیٹر عصمت نے

دفتر عصمت دہلی سے شائع کیا

جملہ حقوق محفوظ

سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر

بزم رفتگاں

تصنیف

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ

جسے

رازق الخیری ایڈیٹر عصمت و بنات نے

دی عصمت ایجنسی دہلی سے شائع کیا

پہلی مرتبہ

اگست ۱۹۳۶

قیمت [illegible] آنے

بزمِ رفتگاں

اباّ جان کا مبارک سایہ بدنصیب قوم کے سر سے اٹھے [illegible] زیادہ ہو گئے، لیکن ان کی بےمثیل خدمات، اُن کے علم و فضل، اُن کے استقلال اور ایثار، ان کی وضعداری اور خلوص کی یاد میں طبقۂ نسواں، ادبی دنیا، اور اُن کے ملنے والے امیر و غریب سب اسوقت تک سوگوار ہیں۔ جن کی مفارقت ابدی پر لاکھوں انسانوں نے آنسو بہائے جنکی یاد میں ملک کے قریب قریب تمام مشہور لکھنے والے مردوں اور عورتوں نے تعزیتی مضامین، اور مرثیے لکھے انہوں نے بھی گذشتہ پچیس سال میں اسی قسم کے مضامین دوسروں کیلئے لکھے تھے۔ اُن کے لئے جنہوں نے گلستان اُردو کی آبیاری کی تھی اور جو مملکت سخن کے حکمراں تھے، یا وہ رہنما تھے جنکی ساری زندگی خدمت قوم میں گذری، یا وہ خواتین تھیں جنکی علمی قابلیت ملک و قوم کیلئے باعث فخر تھی۔ ان میں حضرت مصور غم کے لڑکپن اور جوانی کے وہ مخلص اور پابند وضع دوست بھی تھے جنہیں وہ ہمیشہ یاد کر[illegible] اور وہ جگر کے [illegible] بھی، جن کا خیال دم واپسیں تک نہ گیا۔ یہ بچھڑی [illegible] صورتیں جنہیں دنیا سے اٹھے مدتوں ہو چکیں، مصور غم کا تخیل جنکی یاد میں گلہائے سدابہار چمن ادب میں کھلا گیا، ایک ایک کر کے جمع ہوتے اور بزم رفتگاں آراستہ ہوتی ہے۔ ذوق ادب رکھنے اور مصور غم کی تحریروں پر سر دھننے والو! عقیدت کے قدموں سے بڑھو، قدردانی کی آنکھوں کو بچھو، یہ باکمال جنکا ثانی اب مادرِ گیتی صدیوں پیدا نہ کر سکیگی تشریف فرما ہیں، آنکھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جائینگی، مگر اس پایہ کے لوگ اب نظر نہ آئیں گے، کان ترسیں گے مگر ایسی باتیں اب نہ سن سکو گے۔ آہ وہ مصور غم جو دردمند دلوں کو تڑپاتے تھے، وہ بھی انہیں میں جا ملے۔ جی بھر کر انکی زیارت کر لو، انکی باتیں سنو اور پھر فاتحہ کیلئے ہاتھ اٹھا دو۔

۱۰ اگست ۱۹۳۶ء — رازق الخیری

یادگار مصنوعہ حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ

رسالہ عصمت دہلی

ہندوستان بھر کے تمام زنانہ اخبارات و رسائل میں سب سے اچھا اور سب سے زیادہ چھپنے والا مشہور و معروف باتصویر ماہوار رسالہ ۴۲ سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے عصمت ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور ملک کی بہترین لکھنے والی خواتین کے اعلیٰ درجہ کے مضامین ۸۰ صفحوں پر ہر ماہ شائع کرتا ہے عصمت ہی وہ رسالہ ہے جو صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے شریف بیگمات کے لئے ہندوستان کا چوٹی کا رسالہ سمجھا جاتا ہے۔ سالانہ چندہ چار روپیہ (للعہ ر)

رسالہ بنات دہلی

حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ نے ۱۹۲۶ء میں یہ ماہوار رسالہ مسلمان لڑکیوں کے لئے جاری فرمایا تھا۔ نو سال میں اس کا کسی ایک ماہ کا پرچہ بھی ایک [illegible] تاخیر سے شائع نہیں ہوا عصمت کی طرح بنات بھی پابند وقت ہے۔ لڑکیوں اور بچیوں کے لئے بہترین مضامین سبق آموز نظمیں۔ مزیدار کہانیاں شائع کرتا ہے زبان اتنی آسان کہ گیارہ برس تک کی بچیاں سمجھ سکتی ہیں۔ سال میں ایک خاص نمبر شائع ہوتا ہے بنات باتوں ہی باتوں میں لڑکیوں میں مذہبیت پیدا کر دیتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ جو بذریعہ منی آرڈر بھیجا جائے۔ بذریعہ وی پی عہر۔ نمونہ مفت۔ مینجر عصمت و بنات۔ دہلی

عم مغفور استاد مرحوم

بے نظیر تھیں اور لاجواب، بے مثل تھیں اور نایاب، وہ پاک اور صاف روحیں، جو عالم حیات میں ہشاش بشاش آئیں، شاداں و فرحاں رہیں، اور شگفتہ و خنداں رخصت ہوئیں، دنیا ان کے فراقِ ابدی پر خون روئی، آسمان و زمین انکی موت پر بیتاب ہوئے۔ زندوں نے ان کا ماتم اور مردوں نے ان کا غم کیا، اپنوں نے سر پیٹے، غیروں نے آہ اور سننے والوں نے واہ کی۔

ان کی رخصت عزیزوں کی بربادی، ان کا کوچ، دوستوں کی بدنصیبی اور ان کی موت قوم کی موت تھی۔

یہ متبرک صورتیں کیا تھیں؟ کیا ہو گئیں، اور کیا کر گئیں، یہ وہ لوگ تھے جن کے وجود پر دنیا ناز کرتی رہی اور طبقۂ انسانی تا دمِ بقا ان کے نام سر آنکھوں پر رکھے گا، جن کی تقریریں بیہوشوں کو ہشیار، جن کی تحریریں بے خبروں کو خبردار کر گئیں، [illegible] توں کو رلانے، اور سوتوں کو جگانے والے، آج خود منہ سر لپیٹے جنگل بیابان میں پڑے ہیں۔

مئی سنہ ۱۹۱۲ء کی تیسری رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے۔ عم مغفور استاد مرحوم شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کا جنازہ وسط صحن میں رکھا ہوا ہے۔ غسل و کفن ہو چکا صبح کا انتظار اور دفن کی دیر ہے کہ یہ نورانی صورت ہمیشہ ہمیشہ کو پیوند زمین ہو جائے۔ رات اپنی منزل طے کر رہی ہے، آسمان تاروں سے پٹا پڑا ہے اور وہ گھر جس میں ہر وقت شیر دھاڑ رہا تھا سنسان

فہرست

کو جدا کر گئی جس کی نظیر آنے والی دنیا اب مشکل سے پیدا کرے گی۔ مولانائے مرحوم کب پیدا ہوئے کہاں ہوئے، کیا سیکھا کس سے سیکھا، یہ پھر سہی اس وقت تو رونا یہ ہے کہ علم بزرگوار کی موت کیا کر گئی۔

ابھی تو منہ سے یہ لفظ نکالنے کو جی نہیں چاہتا خدا نہ کرے کہ مقدس اُستاد کا سایہ سر سے اُٹھے مگر کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت۔ راشد اور راشد کیساتھ تمدن دونو یتیم ہوگئے۔

جو آنکھیں مولانائے مرحوم کی تحریر کا لُطف اُٹھا چکی ہیں اور جو کان مَن لائے مغفور کی تقریر کا مزا لوٹ چکے ہیں وہ شاہد ہیں اس امر کے کہ شمس العلما مولانا نذیر احمد کی نظیر کامل ایک صدی میں بھی زمانہ پیدا نہ کرسکا۔ زندہ ہیں وہ سماں دیکھنے والی آنکھیں کہ مولانائے مرحوم کی تقریر پڑھن پر سے کبھی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور کبھی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے!

اُستاد مرحوم کا وطن گو ضلع بجنور تھا اور دلّی میں جس وقت تشریف لائے تو سن پندرہ سولہ سال کے قریب تھا زبان کو جو کچھ ماں کی گود سے لینا تھا لے چکی تھی۔ مگر مولانائے مرحوم نے دلّی کی زبان اس طرح حاصل کی کہ اُردوئے معلّےٰ کا مز[illegible]یا۔ سرزمینِ جہان آباد اُس زبان پر مدۃ العمر ناز کرے گی جو مغفور کے ساتھ قبر میں دفن ہوگئی۔

ادب عربی مدتوں شمس العلماء مولوی نذیر احمد پر حسرت کے آنسو بہائے گا اور قوم ہمیشہ مولانائے مرحوم کی بیش بہا خدمات کی ممنون رہے گی۔

پنجابی کٹرہ جو دلّی نے ریلوے اسٹیشن پر اس طرح قربان کیا کہ آج اُسکا نام ونشان تک نہیں۔ میرے آباؤ اجداد کا مسکن تھا اور پنجابی کٹرہ کی وہ مسجد جس میں میرے جد امجد مولوی محمد عبد الخالق صاحب حدیث کا درس دیتے تھے۔ طلبا کا

پڑا ہوا ہے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ کے نعرے لگا رہے ہیں اور راشد بدنصیب اس منہ کو تک رہا ہے جس سے پھول جھڑے اور اُن آنکھوں کو دیکھ رہا ہے جن کو ظالم موت ہمیشہ کو بند کر گئی۔

جسد خاکی سے رخصت ہونے والی روح! اپنے ادنیٰ خادم کا آخری سلام قبول کر۔ کیسی کیسی مقدس روحیں تیرے استقبال کو آئی ہیں، محبت بھری نظروں سے میرے سلام کا جواب دے اور اصلی گھر سدھار جا۔

آج نواب مرزا کا کوچہ فردوس بریں کا نمونہ ہے۔ عالم ارواح کے وہ مکیں جن کے نام صفحۂ دنیا پر چمک رہے ہیں اس سنگین مکان میں جمع ہیں اور جھوم جھوم کر اُس شعر کو ادا کر رہے ہیں جو آج سے تقریباً پندرہ برس پہلے مولانائے مرحوم نے سرسید کی شان میں کہا تھا ؎

استے روئے گی سر پہ ہاتھ رکھ کر قوم بدقسمت
اور اس کو دیکھ لیگا جو کوئی جیتا رہا باقی

عالمِ خیال اُستاد مرحوم کے طفیل آج اُن مقدس صورتوں کی زیارت کر رہا ہے جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں، اہلِ قلم کی یہ بزرگ جماعت مرحوم سرسید کی صدارت میں عالم ارواح سے چل کر اس پاک روح کے استقبال کو آئی ہے جس کی قومی خدمات کا ڈنکا آسمان تک بج رہا ہے۔ بقاء دوام کے مہکتے ہوئے پھول اُن کے مبارک ہاتھوں میں ہیں اور ملاء اعلیٰ کے بسنے والے باواز بلند قومی موت کے نعرے لگا رہے ہیں۔

(۲)

موت یا فراقِ ابدی، امیر غریب بڈھے جوان، ہندو مسلمان، ہر ایک کا قابل افسوس ہے، مگر شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی موت، ہم سے ایک ایسے بزرگ

دیر بعد وہی عورت پونے چار آنے واپس لائی اور کہا "سوا بارہ آنے کی جوتی آئی ہے۔"

یہ تعلق مولانائے مرحوم کے واسطے کوئی مابہ الامتیاز شے نہ تھی۔ مدرسہ کا سلوک ان سے وہی تھا جو ہمیشہ رہا۔ اور جو سب طالب علموں سے تھا۔ شام ہوتے ہی تھوڑی سی روئی اور تیل سب کو مل گیا۔ اپنے ہاتھ سے بتیاں بٹو اور جلاؤ۔ جس کا تیل زیادہ خرچ ہو وہی شاباش کا مستحق ہے۔ مسلمانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی اور اگلے زمانہ کے لوگ' انتظام اتنا معقول کہ تیل کی ایک بوند بھی ضائع نہ ہو۔ اور شوق ایسا بڑھا ہوا کہ چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ تیل نبٹر گیا' رات کہیں کی کہیں پہونچی مگر سبق یاد کئے بغیر سونے کو جی نہیں چاہتا۔ مولانائے مرحوم اکثر فرماتے تھے "مدرسہ میں سناٹا ہوتا تھا۔ سب پڑے سوتے تھے اور میں چراغ کے آگے اپنا سبق یاد کرتا ہوتا تھا"

یہ تھا وہ ذوق و شوق تعلیم، تربیت اور فیض صحبت جس نے مولانائے مرحوم کو انسانیت کے پورے جواہرات سے مزین کرنے کے بعد ان کا اسم گرامی آسمان ادب پر قمر چہاردہم کی طرح چمکا دیا۔

مجھے اس وقت اُستاد مرحوم کی قابیت ملازمت احسانات خدمات کسی سے بحث نہیں البتہ کچھ کہنا ہے اس کتاب کے متعلق جو اہات الامہ کے نام سے مشہور ہوئی اور جس پر بحث کرتے ہوئے بارہ[1] مئی کے روزانہ پیسہ اخبار میں مولوی سید احمد صاحب نے ان لوگوں کو جنھوں نے محض اغراض نفسانی کی وجہ سے اس کتاب کی مخالفت کی نہایت معقولیت سے جواب دیا ہے۔

مولانائے مرحوم قبر میں جا پہونچے اور مجھکو پہونچنا ہے مگر میں شاہد ہوں

---

[1] سنہ ۱۲ مئی کے دوسرے ہفتہ کی کوئی تاریخ ۔ ۱۲

دارالقیام ۱۲۸۵ھ یا اس کے لگ بھگ کا ذکر ہے کہ علامہ موصوف تحصیل علوم کی غرض سے اس مسجد میں داخل ہوئے گو اقبال کا ستارہ پیشانی پر چمک رہا تھا مگر افلاس کی مصیبت سر پر ٹوٹ رہی تھی تاہم شوق علم پائے ثبات اکھڑنے نہ دیتا تھا۔

ان ہی دنوں میں میری بڑی پھوپی کے عقد کی تجویز پیش ہوئی۔ اگلے لوگوں کی باتیں اُن ہی لوگوں کو سزاوار تھیں۔ بڑی بڑی درخواستیں موجود تھیں اور ارمان تھا کہ مولوی زادی کی پالکی دروازہ پر اُترے ایسے مولانائے مرحوم کی طرف کیا عزیز و اقارب اور کیا دوست آشنا کسی کا وہم گمان بھی نہ تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ امیروں رئیسوں عالموں فاضلوں کے ہوتے ساتھی ایک پردیسی طالب علم کو کون پوچھتا۔ مختصر یہ کہ مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم کے سامنے سب نام پیش کئے گئے۔ اللہ غنی کس دل گردے کے لوگ اور کیسے صابر و شاکر بندے تھے۔ مولوی صاحب مرحوم کیا فرماتے ہیں "جس شخص میں یہ تین صفتیں ہوں اس سے کر دو۔ نماز کا پابند، معاملہ کا اچھا اور زبان کا سچا"۔ امیدواروں میں تو ایک بھی اس کسوٹی پر پورا نہ اُترا۔ تلاش کے دائرہ کو وسیع کیا تو نگاہ مولانائے مغفور پر جا کر ٹھٹکی۔ آج مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم اور [illegible]ی نذیر احمد صاحب مغفور دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں مگر مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم جیسے جید عالم کی پوتی کا بیاہ لینا جس کے عقد کی شرطیں یہ کچھ کڑی ہوں اُستاد مرحوم ہی کا کام تھا۔ خدا غریق رحمت کرے میری بڑی پھوپی کو اس شادی کا ذکر اس طرح فرماتی تھیں کہ جب مسجد میں نکاح ہو چکا ہے تو دولہا کو ہم سب نے بھی دیکھا۔ کرتہ پاجامہ سفید تھا ٹوپی بھی خاصی تھی مگر جوتی کے کنّے نکلے ہوئے تھے اماں نے ایک عورت کے ہاتھ چپکے سے ایک روپیہ بھیجا کہ جوتی پہن لو۔ تھوڑی

یہ کتاب حاصل کی گئی اور جو اس کا حشر ہوا اس کا خیال تکلیف دہ ہے۔ انتقال سے چند روز پہلے جب میں نے "امہات الامہ" کی اشاعت کے واسطے عرض کیا تو خاموش ہو گئے۔ مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ صورت چند روز کی مہمان ہے اصرار کیا، مجبور کیا، ضد کی، بگڑا، منت کی، خوشامد کی، آخر مولوی رحیم بخش کو بلا کر کہا کہ کوئی جلد مل سکتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا تو فرمانے لگے کہ "بیٹا جانے دو"۔ ایسے ناز بردار بزرگ ایسے شفیق اُستاد اب کہاں۔ میری التجا حد سے بڑھ گئی تو چاروں طرف کتاب تلاش کی۔ آخر ایک جگہ سے بہ مشکل تمام دس روز کے واسطے ایک خاص شرط پر مل سکی۔ رات کا وقت تھا کہ مجھکو طلب فرمایا کتاب دی اور حکم دیا کہ اپنے ہاتھ سے اس کی نقل کر لو اور تکمیل کے بعد مجھکو سُنا دو۔ ہائی سو روپیہ تک کے خریدار ایک ایک جلد کے موجود ہیں ایسا نہ ہو کہ کتاب تلف ہو جائے۔ میں نے ناراکتاب نقل کی لکھکر حاضر ہوا۔ مناسب ترمیم اور تغیر و تبدل کے بعد وہ بیش بہا اوراق اب میرے پاس ہیں۔ لیکن مجھ جیسا گوشہ نشین جو داخل شدہ ضمانت ہی کے واسطے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہے۔ مخالفین کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ البتہ کتاب میرے کلیجہ سے لگی ہوئی ہے۔ اور اگر اسکی اشاعت میرے ہاتھوں ہو گئی تو یہ کہوں گا۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

عصمت مئی سنہ ۱۹۱۲ء

سلہ خدا غریق رحمت کرے ابا جان نے "امہات الامہ" کا ایک بڑا حصہ عصمت دہلی میں مسلسل دو تین سال تک شائع کرنے کے بعد سنہ ۱۵ء میں کتاب کا پہلا حصہ بصورت کتاب شائع کر کے کئی ہزار کی تعداد میں غیر مسلموں میں تقسیم کیا تھا۔ انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد مشرف الحق صاحب مرحوم ایم اے پی ایچ ڈی ڈھاکہ کر رہے تھے اور بڑے حصے کا ترجمہ کر چکے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

رازق الخیری

اس امر کا کہ گذشتہ دس سال میں مرحوم کی زبان سے کلام ربانی کی کبھی کوئی آیت اس طرح نہ نکلی کہ آنکھ سے آنسو نہ گر رہا ہو۔

ناظرین تمدن کو وہ مضمون یاد ہوگا جو مئی ۱۹۱۱ء کے پرچہ میں "انسان فرشتہ کی عینک سے" کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ مضمون جب مولانا نے مرحوم نے سُنا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ بدن کانپ رہا تھا، ناخوش ہوئے اور میرے سامنے ایک مختصر سا لکچر شروع کیا۔ وہ وقت میری آنکھ کے سامنے ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آتے ہی ان کی حالت بگڑ گئی زار قطار رونے لگے اور مجھ سے فرمایا اگر اجرار تمدن کا مقصد اسلام کی تضحیک ہے تو آئندہ مجھکو صورت نہ دکھانا۔

وہ شخص جو اسلام اور بانی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایسا شیدا تھا کیا اس صلہ کا مستحق تھا کہ علمار اسلام یہ فتویٰ دیں کہ اس کے جنازہ کی نماز درست نہیں؟

حق الامر یہ ہے کہ "اُمہات الامہ" وہ کتاب تھی کہ نہ آج مسلمانوں میں ایسا کوئی نظر آتا ہے نہ آیندہ برسوں نظر آنے کی امید ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے اس قابلیت سے پیغمبر اسلام صلعم کی رسالت کو ثابت کر جائے۔ اور مسلمانوں کے واسطے اتنا لٹریچر مہیا کردے جو اُمہات الامہ میں ہے۔

قوم کی بدقسمتی ہے کہ علامہ بلگرامی نے "اُمہات الامہ" کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور یقیناً دیر یا سویر میں اجازت حاصل کرلیتا مگر علامہ موصوف کی موت نے تکمیل نہ ہونے دی۔

بعض اخباروں کی رائے کہ مولانا نے مرحوم کو جب یہ معلوم ہوا کہ علمار اسلام اس پر معترض ہیں تو کتاب ان کے حوالہ کردی قطعی غلط ہے جس طرح

کسے خبر تھی کہ یہ قطعۂ آراضی جس پر آج شاہجہاں کی نظر شفقت پڑ رہی ہے۔
ایک روز ان پاک روحوں کا مسکن ہوگا اور ان کے مقدس ہاتھ ایسی عمارتیں
بنائیں گے جو روئے زمین پر بے نظیر ہوں گی۔

لو معزز سیلانیو! دل کی آنکھیں کھولو، دیکھو دیکھو اور سنو کیسی کیسی
صورتیں سامنے ہیں۔ قلم ان کی توصیف میں مجبور، زبان اُن کی مدح سے
معذور، کس کی مجال ہے کہ ان کے احسانات کا حق ادا کر سکے۔ یہ ملک سخن
کے تاجدار، عالم ارواح سے چل کر دنیا کے اجسام میں آئے ہیں، اور مرحوم
آزاد کی ملاقات کے مشتاق ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کا دسواں سال
شروع ہے۔ بائیسویں شب اس بلبل خوش الحان کو جس کی نغمہ سنجی کلیجے
ہلا دیتی تھی، ہم سے جدا کر رہی ہے۔ گو مرحوم آزاد کو اس خاک پاک میں
سونا نصیب نہ ہوا، جس کا وہ دم واپسیں تک دلدادہ رہا۔ مگر اس کی
روح جسد خاکی سے وداع ہوتے ہی ان قدردانِ سخن کی خدمت میں
حاضر ہوتی ہے۔

اللہ اللہ کیسے اچھے لوگ ہیں، ان کی باتیں سنو، اور ان کی صورتیں
دیکھو۔ بزم اُردو کے معزز مہمانو! تمہاری آنکھ بند ہونے کی دیر تھی زمانہ کچھ
کا کچھ ہو گیا، وہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ تمہارے دامانِ شفقت سے
جدا ہوتے ہی بدنصیب اُردو پر وہ ستم ٹوٹے کہ زندگی وبال ہو گئی۔ اغیار کی
بے اعتنائی کا ذکر نہیں گھر کے بھیدیوں نے وہ لنکا ڈھائی کہ چھکے چھڑا دیے۔
نتھرے ستھرے صاف شفاف پانی کے چشمے میں کھاری بد ذائقہ میلے
کچیلے ملاؤ نے اصلی آب و تاب غارت کر دی۔ تمہاری آنکھیں دیکھی ہوئی دو
چار صورتیں بہتیرا تڑپیں، اور پھڑ پھڑائیں، مگر کون سنتا تھا جب پودے

بزم شعرا اور مرحوم آزاد

دیکھنا دیکھنا، برادرانِ وطن! کہیں ایسا نہ ہو کہ آنکھ جھپک جائے۔ بسا غنیمت ہے یہ وقت اور نعمتِ غیر مترقبہ یہ محفل۔ رات گئی تو پھر ہاتھ آنے والی نہیں۔ چاند چمکے گا، تارے چھٹکیں گے، راتیں بہت سی آئیں گی اور جائیں گی، مگر تم کہاں اور یہ صورتیں کہاں۔ دلِ مجروح خون کے آنسو روئے گا۔ آنکھیں چاروں طرف ڈھونڈھیں گی، مگر یہ سماں نظر نہ آئے گا۔

آج آبادی سے سات ساڑھے سات میل کے فاصلے پر اس گورستان میں جہاں کا چپّہ چپّہ اور کونہ کونہ بیش بہا جواہرات سے مالا مال ہے۔ وہ مقدس صورتیں جمع ہوئی ہیں، جن کے مبارک ہاتھ چمنستانِ اُردو میں وہ پودے لگا گئے۔ جو قیامت تک تر و تازہ رہیں گے، اور وہ سدا بہار پھول کھلا گئے، جنہوں نے تمام دنیا کو معطر کر دیا۔

رفتارِ زمانہ کے شیدائیو! ان پیچ دار پگڑیوں اور لمبی ڈاڑھیوں کو دیکھ کر تعجب نہ کرنا، یہ شہر آبادی کے بسنے والے ہیں، ان کا لباس تیرہویں صدی ہجری کا نمونہ ہے۔ یہ وہ ہیں جو مر گئے، اور وضع کو ہاتھ سے نہ دیا، پیوند زمین ہو گئے، لیکن آن بان میں فرق نہ آنے دیا۔

یہ اُن باکمال بزرگوں کا مجمع ہے، جو دلّی کی خاک سے اٹھے، یا سرزمین جہان آباد میں اکتسابِ علم کیا۔ آسمانِ ادب پر چودھویں کا چاند ہو کر چمکے، اور بزمِ اُردو میں ایسے فانوس روشن کر گئے، جو بھولے بھٹکے مسافروں اور منزل پر پہنچنے والوں کی ہمیشہ رہنمائی کریں گے۔

سے خلعت پہنایا، سب نے مبارکباد دی۔ اس کے بعد حضرت داغ کھڑے ہوئے، ہاتھ میں ایک فرمان تھا، اور نگاہِ شوق شمس العلمار کے رخِ روشن پر صدرِ انجمن کے اشارے سے یہ تقریر شروع کی۔

حسرت نصیب زبان اُردو سے زیادہ قابلِ رحم کون ہوگا، جس کی ایک بیس پچیس ہی برس میں وہ کایا پلٹی کہ خدا دشمن کی نہ کرے۔ یہ وہی زبان ہے، جو کسی وقت شہزادیوں کا زیور، بادشاہوں کا جوہر، ایک عالم کی محبوب، ایک دنیا کی مرغوب، ہندوؤں کی جان مسلمانوں کا ایمان تھی۔ مگر تقدیر نے اس کو وہ وقت دکھایا، جب اس کے قدردان ایک ایک کرکے دنیا سے چلنے شروع ہوئے، جس جگہ ہر وقت بلبلانِ خوش الحان کی چہکار اور گلہائے رنگین کی مہکار تھی۔ وہاں ایک ہو کا میدان رہ گیا۔ کبھی کوئی پھرتا پھراتا پردیسی سیلانی ادہر سے گذر جاتا، تو کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر دو آنسو بہا لیتا۔ ورنہ اس کی اگلی بہاریں سب ختم ہوگئیں، انگریزی کے زبردست سیلاب نے اس کی ٹھنڈی اور میٹھی لہروں کا خاتمہ کردیا۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں آزاد کی کوششیں شکریہ کی مستحق ہیں، جس کے دم سے چمنستانِ ادب گلزار بنا رہا۔ بدقسمتی سے آزاد کو وقت ایسا ملا، جب اُردو کے قدردان باری باری عدم آباد کا رستہ لے چکے تھے۔ کوئی اتنا بھی نظر نہ آتا تھا کہ منزلِ مقصود کا پتہ دے۔ مگر وہ مردِ میدان ہمت نہ ہارا، گو دل کے حوصلے پورے ہونے کی اُمیدیں خاک میں مل چکی تھیں، مگر دُھن کا پکا، ارادے کا سچا، اپنی کوششوں میں سرگرم رہا، اور اس باغ میں جو نذرِ خزاں ہو چکا تھا، ایسے ایسے پھول کھلا گیا، جو مدتوں آتے جاتے مسافروں کے دماغ مفرح کرتے رہیں گے۔

کو تم نے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر رنگ برنگ کے پھول کھلائے - آج اس کا خدا حافظ ہے -

سنگلاخ زمین کو دم بھر میں گلزار بنا دینے والے بزرگو! کہاں ہو' کدھر ہو' قلعہ معلّیٰ کی بھری پری بیگم' لٹی کھٹی تمہارے دربار میں ہے اسکی فریاد سُنو' اور انصاف کرو - یہ محلوں کی رہنے والی آج دربدر ماری ماری پھر رہی ہے' اور کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا - تمہاری بدولت اس نے بڑی بڑی سلطنتوں پر حکومت کی اور ایک عالم میں اُس کا ڈنکا بجا -

عالم ارواح کے ستارو! تمہارا ہی طفیل تھا کہ اس کے حُسن کو چار چاند لگے ، نزاکت اس کی لونڈی' فصاحت اس کی چیری' بلاغت اس کی زرخرید - تمہارا مُنہ موڑنا تھا' کہ اس کی چمک ماند' اس کی رنگت پھیکی' اس کی آب و تاب ختم' اس کی روشنی مدہم' غرض سارے جوہر زائل ہو گئے -

کیسا پُرلطف سماں اور بہار کی محفل ہے - میر' سودا' درد' سے لیکر داغ تک تمام سخنور موجود ہیں - یہ وہ فقیر ہیں جو مر کر اقلیم سخن کے بادشاہ ٹھہرے - گو زمانہ نے جیتے جی اُن کی قدر نہ کی' مگر اُن کے دماغوں سے ایسے چشمے پھوٹے کہ خلق اللہ ہمیشہ ہمیشہ سیراب ہو گی -

کرسی صدارت پر میر صاحب رونق افروز ہیں - غالب' ذوق' مومن' اور ان کے ساتھ وہ تمام شعرائے باکمال جن پر دلّی ناز کر رہی ہے تشریف فرما ہیں - دفعتاً شمس العلما آزاد کی تشریف آوری کا غلغلہ بلند ہوا - کشتی زرنگار میں خلعت ہفت پارچہ رکھا تھا - آزاد کا داخل ہونا تھا' کہ خوش آمدید کے نعرے لگاتے ہوئے اہلِ محفل تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے - ذوق سب سے بڑھے شوق سے لائے' ملک الشعرا خاقانی ہند نے میر صاحب کی اجازت

کیا - کمال کے قدر دانوں نے اشتیاق آمیز نظریں بلند کیں، مہمان نوازی کے ہاتھوں سے جہان آباد کی آخری یادگار کو سر آنکھوں پر لیا۔ مگر زمانہ کی گردش نے دلّی کے ساتھ ہی لکھنؤ کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ آزاد کا جی نہ لگا - اور ۱۸۶۴ء میں لاہور آئے، ہال رائڈ صاحب کی قدر شناس آنکھوں نے علم کی کسوٹی پر اس گوہر گراں بہا کو پرکھا، اتالیق پنجاب کی سب ایڈیٹری نذر کی - شاہجہانی عمارت کی خدمت آرزوئے دیرینہ تھی - آزاد نے اپنی صناعی سے وہ وہ گلکاریاں کیں کہ تمام پنجاب کلمہ پڑھنے لگا - استعارات و تشابیہ کی ایسی دیویاں کھڑی کر دیں کہ ہندوستان بھر مسخر ہو گیا، اور ۱۸۸۷ء کی جوبلی نے خطاب شمس العلماء سے آزاد کی قابلیت و خدمات کا اعتراف کیا -

آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری، جامع القواعد، قصص ہند کا دوسرا حصّہ، اُردو کی پہلی، دوسری، تیسری، مجموعۂ نظم اُردو، دیوانِ ذوق یہ وہ چیزیں ہیں جو اس کا نام ہمیشہ زندہ رکھیں گی -

کامل پینتالیس سال کی خدمت کے بعد اُردو نے اگست ۱۹۰۹ء میں اس نئی طرز کے موجد کو الوداع کہی - یہ وہ وقت تھا جب قابل بیٹی کی موت نے دماغ میں آثار جنون پیدا کر دئے - پھر بھی "سیاک وناک" ان خزانوں کا پتہ دے رہا ہے، جو اس دماغ میں پنہاں تھے، دیوانِ ذوق کے خاتمہ پر نثر موزوں جو حالتِ جنوں کی لکھی ہوئی ہے، آج بھی دعوے کر رہی ہے کہ کوئی صحیح دماغ والا دو سطریں اس رنگ میں لکھ دے -

نیک اُستاد کے پھٹے پُرانے کاغذ کے پرزے سامنے پھیلے

یہ زبانِ اُردو کا محسن مرحوم مولوی باقر علی دہلوی کے ہاں ۱۲۴۶ھ ہجری میں پیدا ہوا، ہونہار بچہ کی تعلیم میں باپ نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چونکہ اُستاد ذوقؔ سے بے تکلف دوستی تھی، شاگردی میں پیش کیا۔ ذوقؔ جیسا سکھانے والا، اور آزادؔ جیسا سیکھنے والا۔ آزادؔ جتنا کچھ ہوتا کم تھا۔ اُستاد کے فیض صحبت نے باپ کی دلی آرزو پوری کردی، اور آزاد ایسا شاگرد ہوا، کہ آج اُستاد اس پر نازاں ہے۔ آزاد وہ پہلا شخص ہے، جس نے گل وبلبل کی مضبوط زنجیروں کو توڑا، اور اُردو شاعری کو واقعیت کے ایسے سانچے میں ڈھالا کہ آنے والی نسلیں مدۃ العمر دعائیں دیں گی۔ اُس نے نثر اُردو کو کمالِ معراج پر پہنچایا، اور ایسی یادگاریں چھوڑ گیا جو آنکھوں کو بھاتی ہوئی کلیجہ پر گرتی ہیں۔

قدرت نے اس دماغ کو علم کا کچھ ایسا شوق دیا تھا کہ زندگی اسی تحقیق وتلاش میں بسر ہوگئی۔ گو عمر کا آخر حصہ جوان لڑکی کی موت سے ایک عجیب حالت میں بسر ہوا۔ مگر جب تک دماغ کام کرتا رہا، اُس وقت تک تلاش ختم نہ ہوئی۔ یہی چسکا تھا جو ہندوستان سے ایران کی سرزمین میں لے گیا۔ صحبت کا اثر تلاش کی اعانت اس شخص پر جو ایران سے ہزاروں کوس کے فاصلہ پر پیدا ہوا، ایسا رنگ چڑھا کہ اہلِ زبان بھی اُس کے کلام پر صاحب زبان ہونے کا شبہ کرنے لگے۔

باپ کی شہادت، اُستاد کی موت، ۵۷ء کا غدر، غرض پیہم صدمات نے دلّی کے رہنے میں لطف نہ رکھا۔ اس پر ابنائے وطن کی ناقدری، اور سب سے زیادہ فکر معاش وہ چیز تھی، جس نے آزاد کو دلّی سے جدا کیا، بال بچوں کو ساتھ لے، دلّی کو خدا حافظ کہا، اور لکھنؤ کا رُخ

اے متبرک صورتو! کوئی دم تو اور ٹھہرو، کہ آنکھیں تمہارے دیدار سے سیر ہو جائیں، کس سے کہوں دل پر کیا گزر رہی ہے، دل رو رہا ہے آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں۔ مگر اب تمہاری صورتیں ایک دھندلی سی تصویر دکھائی دے رہی ہیں، آہ وہ بھی نہ رہیں۔

مذاق صحیح اور عقل سلیم دو نو شاہد ہیں۔ نقادان سخن کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ بدنصیب اردو کے سر سے اس شخص کا سایہ اٹھا، جو عمر عزیز کا بڑا حصہ اور زندگی جیسی نعمت کی کل کائنات لطیف زبان کی نذر کر گیا۔ فراق آزاد امید یقینی اور فیصلہ قطعی تھا۔ مگر یہ ہے وہ موت جس پر سینکڑوں زندگیاں نثار۔

زمانہ بدل جائے، مذاق بگڑ جائیں، آسمان زمین سب نئے ہو جائیں، مگر مرحوم آزاد میدانِ سخن میں ایسے موتی لٹا گیا، جو ہمیشہ جگمگائیں گے۔ یہ بے موسم کی ترکاری اور بے فصل کا میوہ ہمیشہ سدا بہار پھولوں کا مزہ دے گا۔

"تمدن" ۱۲ء

ہیں۔ یہ لڑکپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے تک کی نشانی ہیں، انہیں سامنے سے اٹھانا کیسے، بھائیوں کو الوداع کہنا ہے، یہ درست ہے کہ گراں سنگ فرض تھا، اور گراں بہا قرض تھا، جس سے آج میں ہلکا ہوا، لیکن عمروں کا ساتھ ہے، اور دس مہینے دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے۔ موانست رو رو کر دل سے رخصت مانگتی ہے، ہائے دلگیر محنت تھی، لیکن دلپذیر محنت تھی، سخت کام تھا، مگر مزے کا کام تھا، اور ثواب پر انجام تھا۔ اب یہ کہاں، آہ اُستاد کہاں اُستاد"۔

نظم کی لڑیوں میں آزاد نے ایسے موتی پروئے ہیں، کہ جواب نہیں رکھتے، طرز بیان سیدھا سادہ، مگر ایسا کہ کلیجے میں گڑے۔ لطف زبان ایسا کہ ہر لفظ پر بے ساختہ داد نکلے، خیالات کی بلندی، مضمون آفرینی، فصاحت بلاغت کیا چیز ہے جو اس کے ہاں موجود نہیں۔

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے — اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی — اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر — ماہی ہے زیر آب تو طائر درخت پر
بے بیخبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے — داماں دشت میں کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی — چوکا ہے بلکہ راہزن نابکار بھی
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں — سب آ گئے ہیں نیند کی اس وقت لپیٹ میں

جس کو پکاریے، سوئے خواب عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

داغ کی تقریر کا ختم ہونا تھا، کہ وہ صورتیں آنکھ سے اوجھل ہونی شروع ہوئیں، شمعیں جھلملا گئیں، روشنی پھیکی پڑ گئی۔

سے قوم بہ مشکل سبکدوش ہو سکتی ہے۔ گہری گوروں میں سلا چکی۔ ایک بچی کھچی صورت حافظہ بی بی کی تھی یہ بھی آنکھ سے اوجھل ہوئی اور اُن کی رحلت قریب قریب اگلے لوگوں کا خاتمہ کر گئی۔

لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ ابتک مسلمانوں میں طے نہیں ہوا اور بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حافظہ بی بی کی زندگی اس مسئلہ کے طے کرنے میں مسلمانوں کو مدد دیگی۔ اور وہ لوگ جو پرانی تعلیم کو پسند نہیں فرماتے حافظہ بی بی کو سامنے رکھ کر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

علمائے شاہجہاں آباد میں مولوی عبدالخالق مرحوم کا پایہ اتنا بلند ہے کہ سرسید مغفور آثار الصنادید میں لکھتے ہیں:۔

"شہرۂ علم و فضل اتنا بلند ہے کہ گوش فلک کو ہے۔ دیندار تقویٰ شعار ترویج ملت میں ساعی اعلان دین پر داعی وضع میں متین کلام بہت زریں اخلاق ویسا ہی امانت دیانت ویسی ہی اس جامعیت کے ساتھ کوئی کم نظر سے گذرا ہے۔"

حافظہ بی بی مولانا عبدالخالق صاحب کی حقیقی پوتی یعنی مولوی عبدالقادر صاحب کی صاحبزادی۔ اور ہندوستان کے مشہور سحرالبیان مولوی عبدالرب صاحب کی بھتیجی تھیں۔ اُن کی تعلیم کا زمانہ غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل ہے۔ اور یہ وہ وقت ہے مسلمان لڑکیوں کی تعلیم زیادہ تر مذہبی ہوتی تھی جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے ان کو طوطے کی طرح کلام اللہ رٹوایا جاتا تھا۔ بلکہ ان کو ضروری مسائل پر پورا عبور ہوتا تھا۔ فارسی جس کا اب لڑکوں میں بھی کال ہے اس وقت کی لڑکیاں اچھی طرح جانتی تھیں۔ اس ضروری تعلیم سے مالا مال ہو کر حافظہ بی بی میکہ سے سسرال خدمت بیٹھیں۔ اور چند ہی روز میں اپنی خوش

بی بی ام عطیہ النساء مرحومہ

اس اجڑے ہوئے شہر شاہجہاں آباد کی وہ صورتیں جو میری آنکھوں کے سامنے زمین کا پیوند ہوئیں اب بھی جب کبھی یاد آجاتی ہیں تو دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ سُنتا ہوں کہ دلی روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ دیکھتا تو میں بھی ہوں کہ رونق اور چہل پہل پہلے سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن وہ بھولے چہرے اور پاک صورتیں جن کے دم سے شہر بسا ہوا تھا اب نظر نہیں آتیں۔

میں نے سرزمین شاہجہاں آباد میں ان نیک بیبیوں کی زیارت کی ہے جو آجکل کے پڑھے لکھے مردوں کو برسوں سبق دیتیں۔ مگر کچھ ایسی ہوا چلی کہ وہ روشن فانوس جنہوں نے دلی کو جگمگا دیا تھا۔ ایک ایک کرکے بجھنے شروع ہوگئے۔ اور مذہب مقدس کی وہ مجلس جس کے نعرے ایک دنیا میں گونج رہے تھے ایسی سنسان ہوئی کہ سانس تک کی آواز نہ رہی۔

بدنصیب شاہجہاں آباد کا ایک آخری چراغ حافظہ، حاجیہ، قاریہ اُم عطیہ النساء کے پیکر میں دلی ہی کو نہیں تمام ہندوستان کو منوّر کررہا تھا۔ انکی زندگی نہ صرف روایاتِ اسلامی کو زندہ کررہی تھی بلکہ وہ ایک نمونہ تھیں سچے مسلمانوں کا اور ثبوت تھیں اس دعوے کا کہ عورت اسلام کی کیا کچھ خدمت کرسکتی ہے۔ لیکن ۶ مارچ ۱۹۲۵ء نے قدرت کے اٹل قانون کے موافق اس قابل قدر اور بے مثل نسوانی ہستی کو ہم سے ہمیشہ کے واسطے جُدا کردیا۔ موت ان ایہ ناز ہستیوں کو جن کے کارنامے مدتوں یاد رہیں گے اور جن کے احسانات

اور حافظ بھی اُن کا نام سُنکر کان پکڑتے تھے۔ بالآخر ایک وہ دن بھی آیا کہ حافظہ بی بی کے شاگردوں نے قرآن مجید ختم کیا اور جس وقت حافظوں کا یہ پہلا گروہ دلّی میں نکلا ہے تو ہر طرف سے حافظہ بی بی پر مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے بلند ہوئے۔

ہر جمعہ کو بعد نماز ظہر وعظ فرماتی تھیں۔ بیان اس قدر درد انگیز ہوتا تھا کہ بعض دفعہ مجلس تڑپ اٹھتی تھی۔ دو مرتبہ حج کو تشریف لے گئیں اور یہ اُن ہی کا فیض ہے کہ آج دو چار نہیں سینکڑوں حافظہ اور واعظ شہر میں موجود ہیں۔

سچی مسلمان تھیں اس لئے آج کل کے معاملات میں بہت کم دلچسپی لیتی تھیں۔ اور بیشتر وقت مطالعہ کتب میں صرف کرتی تھیں۔ جس روز سے محراب شروع کی آخر وقت تک ناغہ نہ کی۔ دانت ٹوٹنے کا صدمہ صرف اس لئے تھا کہ تلفظ صحیح ادا نہیں ہو سکتا۔ اور قرات کا لطف جاتا رہا۔ مزاج سخت تھا۔ جھوٹی باتوں سے نفرت تھی اور ہر معاملہ صاف رکھنا اور صاف دیکھنا چاہتی تھیں۔

میری حقیقی پھوپی تھیں، اپنی بھتیجی یعنی میری چچا زاد بہن حامدہ بیگم خیریہ کو بیٹی بنا لیا تھا۔ اور آج حامدہ بیگم میں دنیائے نسواں جو کچھ دیکھ رہی ہے یہ مرحومہ ہی کا طفیل ہے۔

ایک واقعہ کا جب کبھی خیال آتا ہے ہنستا ہوں اور روتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میرٹھ میں نوچندی تھی۔ بہن حامدہ چلنے لگیں تو اُن کا برقعہ سر پر ڈال لیا۔ وہ سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ فوراً برقعہ اُتار لیا اور فرمایا:۔

خلقی فرمانبرداری اور قابلیت کی وجہ سے غیروں میں اپنوں سے زیادہ ہوگئیں۔ مگر شادی کو ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ شوہر کی جوان موت نے حافظہ بی بی کی تمام اُمیدوں کا خاتمہ کیا۔ اور عین عالمِ شباب میں بیوہ ہوئیں۔ شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب حافظہ بی بی کے حقیقی بہنوئی تھے۔ مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی حقیقی پھوپھا۔ شاہجہاں آباد کے چوٹی کے علماء کا یہ خاندان کسی طرح جائز نہ سمجھتا تھا کہ حافظہ بی بی کا دوسرا نکاح نہ ہو۔ اُن کی قابلیت کا شہرہ ہو چکا تھا۔ اس لئے اکثر جگہ سے پیام نکاح آنے شروع ہوئے۔ حافظہ بی بی نکاح ثانی کے واسطے تیار نہ تھیں مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنی خواہش کا اظہار بزرگوں کے سامنے کر سکیں۔ خوش قسمتی سے ان کے حقیقی خالو قاری امید علی صاحب تھے کو بی بی ام عطیہ کی اس خواہش کا علم ہوا۔ اور انہوں نے بھانجی کو بیٹی بنا کر اپنے ہاں رکھا۔

کیسا مبارک زمانہ ہوگا، حافظ امید علی صاحب جیسا قاری بی بی ام عطیہ جیسی ذہین شاگرد کو پوری محنت اور توجہ سے پڑھا رہا ہے۔ تین سال میں قرآن شریف حفظ کیا۔ اور قرأت کی ایسی ماہر ہوئیں کہ جب خاندان کے تمام علماء جمع ہوئے اور حافظہ بی بی نے ایک رکوع پڑھ کر سنایا تو دنگ رہ گئے۔

غدر ۵۷ء کے بعد حافظہ بی بی نے والدین کی خدمت میں عرض کر دیا کہ وہ بقیہ عمر کلام الٰہی کی خدمت میں بسر کرنا چاہتی ہیں۔ یہ درخواست منظور کی گئی۔ اور اب بی بی ام عطیہ نے کھاری باؤلی میں اپنے مکان پر سلسلہ درس شروع کیا۔ رمضان المبارک میں تراویح کے وقت سینکڑوں عورتیں جمع اور مستفیض ہوتی تھیں۔ خوش الحان بی بی پر محراب کے وقت ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی۔ صحیح اس قدر پڑھتی تھیں کہ جیّد سے جیّد قاری

خجستہ اختر بانو سہروردیہ بیگم

انفلوئنزا نے یوں تو ہر طرف ستم ڈھایا! اور چھانٹ چھانٹ کر ایسی ایسی بہنیں قبروں میں سلا دیں۔ جن کو عالم نسواں مدتوں روئے گا۔ لیکن خجستہ اختر بانو سہروردیہ بیگم کی موت سے جو نقصان پہنچا۔ اس کی تلافی صدیوں میں بھی ہوتی نظر نہیں آتی۔ عصمتی بہنیں مرحومہ کے نام سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ وہ شروع سے عصمت کی قدر دان تھیں اور اُن کی زندگی اس بات کا ثبوت تھی کہ پردہ نشین خواتین باوجود دنیا کے تمام بکھیڑوں کے علمی دنیا میں مردوں پر سبقت لیجا سکتی ہیں۔ مرحومہ پہلی مسلمان خاتون تھیں جنھوں نے کیمبرج سینیر امتحان پاس کیا۔ اور بورڈ آف ایگزمینرز سے آرٹ کی ڈگری حاصل کی۔ جس میں اسی فیصدی نمبر لازمی ہیں۔ اور جو ایم اے سے بھی زیادہ ہے۔ سہروردیہ بیگم مرحومہ پہلی بی بی تھیں جنھوں نے اس ڈگری کا انعام پانچ ہزار لے کر اس پر آشوب زمانہ میں پردے کی لاج رکھی۔ وہ کلکتہ یونیورسٹی کے فارسی امتحان ایم۔اے کی ممتحن اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی گریٹ برٹن و آئرلینڈ کی ممبر تھیں۔

مرحومہ کی زندگی کا بڑا حصہ اپنے بے زبان فرقہ کی خدمت میں بسر ہوا۔ کلکتہ اور مدناپور کے دونوں سہروردی مسلم گرلز اسکول ان ہی کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ مرحومہ کی بعض کتابوں پر عصمت میں ریویو ہو چکا ہے اور جو بات ہم نے ان کی زندگی میں دبا کر کہی آج کھول کر کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں اب ایسی عورت موجود نہیں۔ ان کی بہتیں خوبی یہ تھی کہ باوجود اِن

" میرا برقعہ نوچندی میں نہیں جا سکتا "

ہنستا اس لئے ہوں کہ برقع کا کیا بگڑ جاتا اور روتا اس لئے ہوں کہ ایسے محتاط لوگ اب کہاں ۔

۷۵ برس کے قریب عمر پائی خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئیں ۔ جنازہ کے ساتھ اُن کے شاگرد سینکڑوں حافظ تھے اور اس اعتبار سے آیندہ تو اب ایسا جنازہ کیا اُٹھے گا ۔ پچھلی چند صدیوں میں بھی مسلمان عورتوں کے ایسے جنازے بہت ہی کم اُٹھے ہوں گے ۔

عصمت ۔ فروری سنہ ۱۹۲۵ء

کتبہ تربت محترمہ خاتون اکرم مرحومہ

خدارا اِس طرف آنا تو پڑھ کر فاتحہ جانا
غریب و نیک بچی ، بے زبان و بے وطن ہے یہ
بہو راشد کی ہے خاتونِ اکرم ہادی نسواں
دلہن جھانسی سے جو آئی تھی ، وہ " رازق دُلھن " ہے یہ

نومبر سنہ ۱۹۲۲ء

مرحومہ زاھدہ خاتون شروانیہ

عصمتی بہنیں ز۔خ۔ش صاحبہ کے اسم گرامی سے اچھی طرح واقف ہوں گی اُن کے مضامین نظم و نثر کئی سال تک عصمت و تمدن میں شائع ہوئے ہیں۔ وہ اس پایہ کی عورت تھیں کہ آج مسلمانوں میں اس کی نظیر مشکل سے ملیگی۔ علاوہ ذاتی قابلیت کے جو ان کے مضامین نظم و نثر سے ظاہر ہوتی ہے ان کا دل قومی درد سے لبریز تھا۔ ان کی فارسی تعلیم ایک ایرانی خاتون سے ہوئی اور اس لئے ان کو اس زبان پر پورا عبور تھا۔ عربی کی استعداد بھی درجہ کمال کو پہونچ گئی تھی اور صرف یہ ان کا ذاتی شوق تھا۔ انگریزی بھی اچھی جانتی تھیں۔ اور اُردو کی نظم تو چند منٹ میں کہ لیتی تھیں۔ موت ہر شخص کی قابل افسوس ہوتی ہے مگر زاہدہ خاتون شروانیہ کی موت قابل افسوس ہی نہیں۔ مسلمانوں کے طبقۂ نسواں کو وہ صدمہ پہونچا گئی جس کی تلافی برسوں نہ ہو گی۔

مرحومہ نواب محمد مزمل اللہ خانصاحب بھیکم پور کی صاحبزادی تھیں۔ یہ درخشندہ گوہر جس کی زندگی سے قوم کی بہت کچھ توقعات وابستہ تھیں۔ دوسری فروری کو غروب ہو گیا انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اُمید ہے عصمتی بہنیں مرحومہ زاہدہ خاتون شروانیہ کے واسطے دعا کرینگی۔ کہ معبود حقیقی ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

"عصمت" فروری ۱۹۲۲ء

تمام حسنات کے وہ اپنے مرحوم و مغفور والد مولوی عبید اللہ العبید ی سہروردی کی تعلیم و تربیت کا نمونہ تھیں - اور اُن کے خیالات میں یہ جدت جس نے آج دنیائے نسواں میں آفت ڈھا رکھی ہے - کبھی چھو کر بھی نہیں گئی - سہروردیہ بیگم کی موت معمولی موت نہیں - مسلمانوں کے واسطے قیامت ہے - ہم کو اُمید ہے کہ مرحومہ کے عزیز و اقارب دونوں مدرسوں کو اس موت کا نقصان محسوس نہ ہونے دیں گے -

گو قدردانانِ قوم سے یہ توقع نہیں مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر سہروردیہ بیگم کی فانی ہستی بھی یادگار کا حق نہیں رکھتی تو یادگار کے کیا معنی ہیں -

ہم اس موقع پر لیڈیز کانفرنس سے ملتجی ہیں کہ وہ اپنے سالانہ اجلاس میں مرحومہ کی یادگار کے متعلق رزلیوشن پیش کرے - اور جلسہ کے انعقاد سے قبل ہماری اس رائے پر اپنے خیالات کا اظہار کرے - ہم محترمہ نفیس دلہن صاحبہ سکرٹری کانفرنس کو یقین دلاتے ہیں کہ عصمتی بہنیں اس یادگار میں ہر طرح ان کا ہاتھ بٹانے پر آمادہ ہوں گی -

عصمت - جنوری ۱۹۱۸ء

محترمہ خاتون اکرم جنت مکانی

حضرت علامہ مغفور کی بہو تھیں - جن کا شادی کے پورے دو سال بعد انتقال ہو گیا - جانہار خاتون کی یاد میں حضرت علامہ مرحوم نے کئی درد انگیز مضامین لکھے تھے جو "وداعِ خاتون" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں -

رازق الخیری

جانہار بچی

سورت کے مشہور رئیس نواب میر مظفر حسین خاں باوجود دور گذشتہ کی صحبتیں اور اگلے لوگوں کی آنکھیں دیکھنے کے ان روشن خیال افراد میں سے ہیں جو وقت کی ضرورتوں سے پوری طرح باخبر اور آشنا ہیں اور جن کے دل میں قوم کا درد ہر وقت رہتا ہے۔ جب میں سال گذشتہ میں سورت گیا تو جو چیز مجھے سب سے زیادہ تعجب انگیز معلوم ہوئی وہ نواب محل کی یہ قابل قدر ہستی تھی۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی جب میں دیکھتا تھا کہ نواب صاحب کے صاحبزادے نواب میر حفیظ الدین صاحب علیگ ایک طرف مغربی معاشرت سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور دوسری طرف اُن کا بچہ بچہ مذہبی رنگ میں غوطہ زن ہے۔ میں نے چلتے وقت سب سے بڑی مبارکباد جو نواب صاحب کو دی وہ اُن کے صاحبزادے کی زندگی تھی۔ جو خذ ما صفا دع ما کدر کے اصول پر بسر ہو رہی تھی۔ میں مبارکباد کا مستحق صرف نواب صاحب ہی کو سمجھتا ہوں کہ ان کی تربیت نے اتنا بڑا کام کیا اور لوگوں کو دکھا دیا کہ کس طرح بچے زمانہ کی ضرورتوں سے باخبر ہو کر چمنستان مغرب سے خوش رنگ پھول توڑنے کے باوجود مشرقی جواہرات سے مالامال رہتے ہیں۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ علوم مغربی کی تعلیم مذہبیت فنا کر دیتی ہے وہ نواب میر مظفر حسین صاحب کے صاحبزادہ نواب میر حفیظ الدین صاحب کو دیکھ کر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگر تربیت کامل ہو تو مذہب فنا نہیں ہوتا۔

میں سورت میں پانچ چھ روز رہا اور مجھے یہ دیکھ کر کس قدر مسرت ہوتی تھی کہ نواب زادہ میر حفیظ الدین سلمہٗ کی بڑی بچی بختیار النساء بیگم ادھر تو سینٹ ہلینا

جا نہار سیّد

کل ہی کی بات تو ہے کہ پیاری سی مینا، چاروں طرف باتیں ملکاتی اور باتوں میں قیامت ڈھاتی پھرتی تھی، آج وہ چار برس کی جان، ماں کی گود خالی، اور باپ کا گھر سنسان کر کے جنگل بیابان میں، خاک کا پیوند ہو گئی میاں اکرام نے مجھے کس دل سے لکھا کہ جا نہار سیّد ہم سے ہمیشہ کو جدا ہو گئی، کیا یہ سچ ہے کہ وہ پھول جو دلّی میں کھلا بھوپال کی خاک میں مرجھانے والا تھا، کیا عزیزہ مسز اکرام کی آنکھیں دیکھ سکیں کہ جا نہار سیّد کا جسم اُونی کپڑوں کے بجائے مٹی کے کفن سے ڈھکا ہوا ہے۔

ماں کے دل پر کیا گزری ہوگی، میں جانتا ہوں، باپ کی حالت کیا ہوئی ہوگی مجھے معلوم ہے۔ مگر مرنے والی سیّد کی ابتدا اسکی جا نہاری کا کافی ثبوت تھی غیروں سے لپٹتی تھی۔ رستہ چلتوں سے چمٹتی تھی اور ایسی باتیں منہ سے اتارتی تھی کہ خواہ مخواہ پیار کرنیکو جی چاہتا تھا۔ ننھے ننھے ہاتھ محبت سے بڑھتے تھے میٹھی میٹھی باتوں میں پھول جھڑتے تھے۔ مگر آہ وہ ہاتھ زمین کا پیوند اور وہ باتیں فنا ہونیوالی تھیں۔

پیاری بچی سیّد، یہ صحیح کہ تو مرنے والی تھی، یہ درست کہ تو اس دنیا میں چار سال کی مہمان تھی، لیکن سیّد تو دلوں سے فراموش ہونیوالی نہیں، موت نے تیری صورت چھپا دی۔ مگر دل تیری محبت نہیں بھلا سکتا، سرزمین بھوپال ایک پردیسن بچی تیری خاک میں آرام کرنے آئی ہے۔ یہ شیخ محمد اکرام کی امانت ہے قدرت کے کرشمے ہیں کہ یہ ابتک ہمارے سینوں پر لوٹی اور اب تیرے آغوش میں پہنچی۔ اسکی قدر کیجیو اور دعا کہ خدا ہم کو صبر دے۔

عصمت جنوری ۱۹۱۹ء

مرحومہ بیگم صاحبہ بھوپال

اس مہینہ کے جانگداز واقعات میں سے ایک ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کی رحلت ہے۔ بیگم صاحبہ مرحومہ کے دل میں امّت مرحومہ کا حقیقی درد موجود تھا اور ان کی عمر کا کوئی حصّہ قومی خدمات سے محروم نہیں ہے۔ دورِ حاضرہ کے اسلامی کارناموں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو سرزمین بھوپال اور ان کے دستِ کرم کا مرہون منت نہو۔ ان کی علمی قابلیت یقیناً یہ حق رکھتی تھی کہ مسلم خواتین اس پر فخر کریں۔ ان کی زندگی کا دور اوّلین پردہ کی ان تمام قیود کے باوجود جو آج سے نصف صدی پیشتر مسلمانوں میں موجود تھیں علوم قدیم و جدید سے لبریز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست بھوپال ایک عرصہ دراز تک مسلمانوں کی روایات قدیمہ کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتی رہی اور گو گذشتہ دس سال سے وقت کی زبردست طاقت مسلم خواتین کو مذہب سے دور پھینکنے میں سرگرم ہے۔ مگر سرکار عالیہ آخیر وقت تک ان خوبیاں کو جو کسی زمانہ میں مسلمان عورتوں کا طرۂ امتیاز تھیں سینہ سے لگائے رہیں۔

تہذیب جدید کی ترویج میں ہر ہائینس کے وجود سے مسلمانوں کو کافی مدد ملی ہے۔ لیکن اسی حد تک کہ شرع اسلام پر حرف نہ آنے پائے۔ مسلم یونیورسٹی کی ترقی اور "سیرۃ النبیؐ" کی تکمیل ثبوت ہیں اس امر کا کہ بیگم صاحبہ مرحومہ کی نگاہ میں دنیوی اور دینی ترقی یکساں تھی۔ اور ان کی دلی آرزو تھی کہ قوم بدبخت ان مصائب سے رہائی پائے جو اس کے اپنے ہاتھوں اس پر نازل ہو رہی ہیں۔ ایسی نیک نفس،

کالج پونا کی تعلیم یافتہ ہے اور اُدھر باوجود متعدد نوکروں باورچیوں اور ماماؤں کے
علی الصباح اپنے ہاتھ سے میرے واسطے ناشتہ تیار کرتی ہے۔ میرے اس قدر احترام
کی تہ میں جو چیز صاف جھلک رہی تھی وہ اس بچی کا حُسنِ عقیدت اور جوشِ مذہب تھا۔
میں کس طرح کہوں کہ میں نے آج کن آنکھوں سے نواب صاحب کا یہ فقرہ پڑھا کہ
"چودہ شعبان یعنی شب برات کے روز اس دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھاری"۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔ باپ دادا اور ماں کے دل کی کیا کیفیت ہوگی یہ تو
اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر اس وقت میری جو حالت ہے وہ میں بیان نہیں کرسکتا مجھے
رہ رہ کر وہ وقت یاد آرہا ہے جب اس جانثار اور عقیدتی بچی نے مجھ سے مرید ہونے
کی خواہش کی۔ اور میں نے کہا کہ مرید کرنا تو درکنار میں نے تو کسی کو مرید ہوتے دیکھا بھی نہیں"
مرحومہ بختیار النساء بیگم کا نکاح ہو چکا تھا۔ وداع عنقریب ہونیوالی تھی اور
وہ بچی جس کو دلہن بنا کر ماں باپ رخصت کرنیوالے تھے۔ اس کو کفن میں لپیٹ کر گھر سے
وداع کردیا۔ یہ موت نواب محل کی آنکھوں میں دنیا اندھیر کر گئی۔ مگر یہ وہ راستہ ہے کہ
اور دیر سویر سب کو اس طرف چلنا ہے۔ یہ پیاری بچی اتنے ہی روز کی مہمان تھی۔ دلی
دعا ہے کہ خدا ماں باپ کو صبر اور مرنے والی کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

بیگم نواب زادہ میر حفیظ الدین کا قلب مضطرب مچھلی کی طرح تڑپ
رہا ہوگا۔ اور اُن کی آنکھیں اس کلیجے کے ٹکڑے کو ڈھونڈھتی ہوں گی جو سینکڑوں
من مٹی کے نیچے سو رہی ہے۔ مگر وہ اتنا ملحوظ رکھیں کہ ان پر چھوٹے بچوں کا
بھی حق ہے۔ خدا کی مشیت پر راضی ہوں اور ان پیارے بچوں کی خدمت میں
مصروف ہوں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ان بچوں کی بہار دکھائے اور ان کی عمریں
دراز ہوں۔

عصمت۔ اپریل سنہ ۲۴ء

مولوی بشیر الدین احمد مرحوم

شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم کے فرزند ارجمند مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے اسم گرامی سے جنکا انتقال ۲۸ر اگست کو ہوا مسلمان اس لئے اچھی طرح واقف ہونگے کہ شمس العلماء مرحوم کی مشہور کتاب "مواعظ حسنہ" میں انہیں سے خطاب ہے اور عصمتی بہنیں اسواسطے کہ زنانہ لٹریچر میں ان کی بعض کتابوں سے قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ مولوی بشیر الدین احمد میرے حقیقی پھوپی زاد بھائی تھے۔ اور ان کی بعض باتیں اتنی اچھی تھیں کہ اب کم از کم ہمارے خاندان میں ایسے لوگ مشکل سے پیدا ہونگے انہیں ایک لاکھ روپے کی صفت یہ تھی کہ وہ کسی شخص سے بھی سخت سے سخت تکلیف پہنچ جانے کے بعد قطع تعلق کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ بہت جلد برہم ہو جاتے تھے۔ مگر غصہ بہت جلد زائل ہو جاتا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ان کی پہلی کتاب "اقبال دلہن" جہاں تک مجھے معلوم ہے بہت مقبول ہوئی۔ اور "حسن معاشرت" وغیرہ نے بھی کافی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے اپنی تصانیف کے ساتھ اپنے والد مرحوم کی تصانیف کی اشاعت کا بھی سلسلہ جاری رکھا۔ اور اگر وہ اس طرف توجہ نہ فرماتے تو "توبتہ النصوح" "مراۃ العروس" جیسی قابل قدر کتابیں اس سے بھی ردی حالت میں شائع ہوتیں جیسی کہ اسی پایہ کے دوسرے مصنفین کی ہو رہی ہیں۔ مولوی بشیر الدین احمد حیدرآباد دکن میں اول تعلقدار یعنی کلکٹر تھے۔ اور ان کی خدمات ریاست میں بھی ہمیشہ وقعت سے دیکھی گئیں ان کے مزاج میں سادگی بہت تھی تصنع اور بناوٹ سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ مذہبی عنصر بہت زیادہ غالب تھا اور موت سے ایک مہینہ قبل تک جب میں ان سے آخری مرتبہ ملا ہوں باوجود ہوش و حواس کامل

رحمدل اور ہمدرد خاتون کا اُٹھ جانا یقیناً مسلمانوں کا ایسا نقصان ہے جسکی
تلافی بظاہر نظر نہیں آتی یہی وجہ ہے کہ اسلامی پریس سرکار عالیہ کے فراق ابدی
پر مصروف فغاں ہے لیکن جس طرح مسلمانوں کی مشکل سے کوئی تصنیف ایسی
ہوتی ہوگی جسکو خوش قسمتی سے سچے معنوں میں ریویو نگار میسر آتا ہو اور ریویو کا دامن
ذاتیات سے پاک ہو۔ اسی طرح بقول مولانا حالی ؎

کی رئیس شہر کی تعریف یاروں نے بہت | پر سبیل تذکرہ کچھ ذکر جو باہم چلا
جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام | جوڑ کر ہاتھ اُن سے حالی نے بصد منت کہا
عیب بھی اسکا کوئی آخر کرو یارو بیاں | سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

ہمارا یقین یہ ہے کہ باوجود ان تمام حسنات کے جو بیگم صاحبہ مرحومہ کی ذات میں
موجود تھیں۔ اور باوجود اسکے کہ تربیت گاہ بنات بھوپال کی ممنون ہے سرکار
عالیہ فرشتہ نہ تھیں۔ بشری کمزوری جو فطرت انسانی کا خاصہ ہے ان میں
موجود تھی۔ اور جو رائے قائم فرمالیتی تھیں اس سے ہٹنا بہت مشکل تھا لیکن
یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ مرحومہ بہ حیثیت مجموعی ایسی خاتون تھیں جن کی نظیر انکی
زندگی میں کیا ان کے بعد بھی مدتوں نظر آنے کی امید نہیں۔ موت نے چمنستان
اسلام کا ایک ایسا چوٹی کا پھول فنا کیا ہے جس نے اس باغیچہ کو بالکل اجاڑ
دیا۔ اور ہم نے سلطان جہان بیگم سابق فرمانروائے بھوپال کی موت میں ایک
ایسی چیز کھوئی ہے جس کو آنکھیں ہمیشہ روئیں گی اور دل ہر وقت ڈھونڈھے
گا۔ جب دنیائے اسلام کی یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ دور حاضرہ کے
والیان ریاست تادم واپسیں نفس کے پنجے میں گرفتار ہیں تو بلا تامل یہ کہنا پڑتا ہے
کہ جنتی بیگم حقیقتاً ولی تھی جس کی زندگی کے وہ تمام پہلو جو مذہب مقدس سے متعلق
ہیں احکام اسلام سے جگمگا رہے ہیں۔

عصمت جولائی ۱۹۳۰ء

مزارِ غالبؔ پر دو آنسو

رات کے اس حصہ میں جب خلقِ خدا میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی، مائیں بچوں کو کلیجے سے لپٹائے بےخبر پڑی تھیں، ہاتھوں کے گجرے اور کانوں کے پھول وداعِ شب کا پیغام لا چکے تھے، دلِ وحشی اس شعر کا لطف اُٹھا رہا تھا جو عزیزم مولوی ابو محمد سید حسن امام صاحب نے سرنامہ پر اس طرح لکھا۔

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے

(بادنیٰ تصرف) لے بیٹھا ہے دو ایک جام لیکن واژگوں وہ بھی (غالبؔ علیہ الرحمۃ)

آج سے بیس برس پہلے کی دلّی آنکھ کے سامنے تھی، خیالات کی رو کہیں سے کہیں پہونچی، اور گو بدنصیب آنکھیں اُستادِ سخن کے دیدار اور اس زمانہ کی تصویروں سے محروم تھیں جسکو "شہرآبادی" کہنے والیاں بھی جنگل میں جا سوئیں تاہم جو کچھ آنکھیں دیکھ چکی تھیں، اور جو صورتیں نظروں سے اچھی طرح آشنا تھیں اُنکی یاد کلیجہ مسل رہی تھی، سردی اچھی اور ٹھنڈی رات، قویٰ ضعیف اور رُوبہ انحطاط، مگر خیالات نے قلبِ مضطرب کو چین نہ لینے دیا، اور جسدِ خاکی اس مقام پر پہونچا جہاں ان مٹنے والوں کی ٹوٹی پھوٹی قبریں پھیلی ہوئی تھیں، جن کے دماغ علم ادب کے دامن پر موتی لٹا گئے، چادرِ مہتاب ان کا سراغ دے رہی تھی، اور گو عالم سنسان تھا، مگر شبنم ان متبرک ڈھیروں پر آنسو بہا رہی تھی!

اللہ اللہ، کیسا پرلطف منظر اور دلچسپ مقام تھا، کچی پکی قبریں، اینٹ مٹی کے ڈھیر، چونہ کے تودے، ڈھے ہوئے تعویذ، اور ٹوٹی ہوئی دیواریں، ان صورتوں کو پہلو میں لئے ہوئے تھیں، جن کے دیکھنے کو لاکھوں ترستی ہوئی آنکھیں ہمیشہ کی

صحیح نہ ہونے کے نماز پابندی سے ادا کرتے تھے۔ مجھکو اپنی چچازاد بہن حامدہ بیگم سلمہا سے یہ سنکر تعجب ہوا تھا کہ وہ اُن کے واسطے دس دس پانچ پانچ روپے کا کپڑا خریدنے کیواسطے خود بازار چلے جاتے تھے۔ اگر اتفاقیہ ضرورت ہو جاتی تھی تو خود بازار چلے جاتے تھے اور لے آتے تھے۔ افسوس یہ ہے ان کی عمر کا آخری حصہ اچھا نہ گزرا۔ ان کی پہلی بیوی ابتک زندہ ہیں۔ مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے دوسری شادی کی اور دوسری بیوی یعنی چھوٹی دلہن سے ان کے کئی بچے موجود ہیں چھوٹی دلہن کے انتقال کے بعد انہوں نے تیسری شادی کی اور ان کی اولاد بھی موجود ہے مگر جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ان تمام تعلقات میں لطف زندگی ان کو کبھی میسر نہ ہوا اور عمر کا آخری حصہ تو یقیناً بہت متاذی تھا - وہ غالباً ڈیڑھ سال کے قریب فالج میں مبتلا رہے اس کا اثر زبان پر بھی تھا۔ جو بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ موت سے دو تین مہینے پہلے نہ وہ خود اچھی طرح بول سکتے تھے نہ دوسرے کی بات سمجھ سکتے تھے۔ میری رائے میں ان کی موت معاملہ نکاح میں مسلمانوں کیواسطے ایک قسم کا سبق دیتی ہے۔ اور ہم بلا کسی خوف کے ان الفاظ کو دہرا سکتے ہیں کہ جہاں کثرت ازدواج بحالت موجودہ ایک مسلمان کیواسطے خوشگوار نتائج پیدا نہیں کرسکتی۔ وہاں مناسبت عمر کے اُصول کو نظر انداز کرنا بھی زندگی کو تلخ کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ بھائی بشیرالدین صاحب کے صاحبزادے میاں منذر احمد بی اے ایل ایل۔ بی اپنے والد بزرگوار اور جد امجد کی قومی خدمات کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں گے اور اس سلسلے میں انہیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرینگے۔ خدا ہمارے عزیز بھائی کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر کی توفیق دے۔

عصمت۔ اکتوبر ۲۷ء

کیسے کیسے لوگ جن کے نام مٹ کر بھی کندن کی طرح دمک رہے ہیں، پیشِ نظر تھے، اجسامِ فانی پر بقار ابدی کا رنگ چڑھا ہوا تھا، اور دل جن کے دیکھنے کو مدتوں ترسا اور تڑپا، آنکھ اس وقت ان کے نورانی چہرے دیکھ رہی تھی۔

پرستش کے قابل تھیں یہ مقدس صورتیں جن پر دہلی مدۃ العمر ناز کرے گی، اور جنکی نظیر اب پردۂ ہستی پر نظر نہیں آتی، کیوں شیدائیانِ ہستی کیسے تھے وہ دماغ، اور کہاں چھپ گئیں وہ صورتیں جن کا فیض آج تک جاری ہے، اور جب تک سلسلۂ حیات کے ساتھ مذاقِ سخن موجود ہے جاری رہے گا۔ کیسی لالہ زار ہوگی وہ سرزمین جس پر ایسے پھول کھلے جن کی پنکھڑیاں رستہ چلتے مسافروں کو باغِ جناں کا دھوکہ دے رہی ہیں۔ اے فانی دنیا، کیا کئے وہ تاجدارِ سخن جن کی کرنوں سے اب تک جذبات کی چادر آب جھلمل جھلمل کر رہی ہے؟ کہاں لے گئی۔ وہ لوگ جن کے منہ سے دم گفتار پھول جھڑے، اور جن کے قدموں سے دم رفتار ایسے چشمے پھوٹے جو اِلیٰ یومنا ہٰذا آب و تاب سے بہہ رہے ہیں۔

اے ظالم موت! کیسے کیسے درشاہوار، دیکھنے دکھانے کے قابل چن چن کر جدا کئے، جن کی یاد کلیجے تڑپا رہی ہے۔

صبح صادق کا وقت قریب تھا، اور دلِ مجروح یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ لعنت کے قابل اور ملامت کے لائق ہے وہ دنیا جو ان شاداب پودوں کو اوجاڑ کر راشد جیسے کانٹوں کا مسکن ہو۔ ضمیر نے اس فیصلہ کی داد دی۔ آنکھ نے حسنِ عقیدت کے آنسو گرائے، فاتحہ کے لہلہاتے ہوئے پھول چڑھا کر مزارِ غالبؔ کی خاک پاک کو بوسہ دیا، اور یہ کہتا ہوا آگے بڑھا۔

"برگزیدہ اور مٹ کر روشن ہونے والی پاک روحوں، یہ آنسوؤں کے

نیند سو گئیں، اور جو داغ ایک دنیا کو مالا مال کر گئے آج ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ان پر فاتحہ خوانی کر رہے تھے۔

انسان بیوفا اور احسان فراموش سب کچھ سہی مگر میں کہتا ہوں قبرستان تعلقات کی کسوٹی ہے، جن کے داغ موت کا پیام تھے ان کے نام سے جی بیزار ہو گیا، آنکھوں میں بسنے والے چند روز میں بھول بسر گئے اور جب موت نے پیاروں کی ہڈیاں تک برباد کر دیں، تو انکی یاد بھی دل سے فراموش ہو گئی۔ غالب مرحوم کی تصویر سے آنکھ آشنا تھی، اور مزارِ غالب حیاتِ مستعار کا درس دے رہا تھا کہ قوتِ متخیلہ نے یہ صدا دی "یہ قبروں کے سونے والے خاک نشین، مردہ نہیں، زندہ ہیں، شاہجہاں آباد کا ہر ذرّہ، اور دریائے سخن کی ہر لہر ان کی بقا ردوام کی شہادت دے رہی ہے۔ گنگا کا بہتا ہوا پانی، برہمپتر کی سربفلک چوٹیاں ان کے گیت گا رہی ہیں۔ مشرق ان محسنوں کی خدمت پوری نہ کر سکا، مگر یہ پھول آج تک اپنی خوشبو سے ملک کو معطر کر رہے ہیں۔ لیکن آن پہونچا ہے وہ وقت کہ مغرب ان کے نقش پا کو سجدہ کرے گا، اور کمال کے کھوجی ان کے نام سر آنکھوں پر رکھیں گے"۔

دل صدائے تخیل پر لبیک کہتا ہوا آگے بڑھا، اب وہ مقدس بزرگ آنکھ کے سامنے موجود تھے، جو خاکِ دلی سے اُٹھے، اور آسمانِ ادب پر چاند بنکر چمکے۔ ان کا فقیرانہ لباس تقدس کے آبدار موتیوں سے جگمگا رہا تھا، اور خلقِ خدا اُن کے اوگلے ہوئے نوالے سر آنکھوں پر رکھ رہی تھی۔ علم و ہنر کے دریا ان کے پاؤں میں لوٹ رہے تھے، اور گو زمانے کی ناقدری نے ان کے متبرک کلیجے جلا دئے تھے، مگر عدل و انصاف کے دیوتا سدا بہار پھولوں کی نچھاور کر رہے تھے۔ کیسا مبارک وقت تھا کیا کیا صورتیں آنکھ کے سامنے تھیں، اور

میر جالب مرحوم

دنیائے اسلام کی موجودہ حالت سے متاثر ہو کر ہنسنا تو درکنار میں رونے کے واسطے بھی تنہائی کا متلاشی ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس میں بھی کوئی میرا ہمنوا نہ ہو یہ ہی وجہ ہے کہ مرحوم حکیم اجمل خاں جیسے مخلص دوست کے فراق ابدی پر میں نے ایک حرف نہ لکھا حالانکہ ان کی محبت ان کا خلوص ان کی وضعداری ان کی عنایتیں حق رکھتی تھیں کہ میں اور تربیت گاہ بنات آنسوؤں کی فوج اور گریہ وزاری کے نالوں میں ان کو رخصت کرے۔ اس شخصیت کا آج ایک مسلمان ہندوستان بھر میں ایسا نہیں جو سال میں تین چار مرتبہ اپنی تشریف آوری سے تربیت گاہ کی عزت افزائی کرتا ہو۔ یتیم بچیوں کو گلے لگاتا ہو اور ان میلے کچیلے کپڑے والیوں کو بوسے دیتا ہو۔ حکیم صاحب کے بعد نواب عبدالوہاب خاں صاحب نائنشل سکرٹری ریاست ٹونک کی رحلت پر میں اور تربیت گاہ جس قدر روئے کم تھا۔ میں نے اس دل کے لوگ اپنی تمام عمر میں دو ایک ہی دیکھے ہیں۔ وہ سچ پوچھو تو ریاست کے مالک تھے۔ مگر اس اختیار اور عزت پر ان کی کیفیت یہ تھی کہ انہوں نے بھری مجلس میں میرے ہاتھ چومے۔ کٹے ہوئے پان کا چمچہ اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں دیا۔ شربت کا گلاس میرے سامنے خود لائے۔ اور میں جب گیا اور جو کہا نہ صرف اس کو پورا کیا بلکہ خوش اور ممنون ہوئے۔ میں نے ان کی موت بھی خاموش کانوں سے سنی اور قلب پر نشتر تک پہونچادی۔ بیرونی دنیا ان دونوں

قطرے خلوص کی آنکھ سے نکلے ہیں، اور عقیدت کی گود سے دودھ پی کر اس قابل ہوئے ہیں کہ قدر دانی کے پھول تمہارے مزاروں پر چڑھائیں فلسفہ قلب کے ماہرو! یہ ناچیز تحفہ قبول فرماؤ، علوم کی شاہراہ آج تمہارے بغیر سونی ہے۔ مغربی ہوا تمہارے روشن کئے ہوئے فانوس گل کر چکی، مگر ابھی کچھ چراغ ٹمٹا رہے ہیں، اور گو بادِ مخالف ان کے سروں پر چل رہی ہے، مگر یہ بجھنے والی نہیں۔ قربان ہونے کے قابل تھے تمہارے وہ مبارک ہاتھ جو اس اجڑی نگری کو آباد کر گئے، جو برباد ہو کر بھی تمہاری گلکاریوں کا نشان دے رہی ہے۔

اس عالمِ تنہائی میں جہاں شبِ ماہ کے سوا کوئی مونس اور روزِ روشن کے سوا کوئی ہمدم نہیں، مالکِ حقیقی تمہارا نگہبان ہو، اور وہ گلہائے رنگیں جو تمہارے خونِ جگر سے سینچے گئے، اور اب تک موسمِ بہار کا لطف دے رہے ہیں، ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں۔

عالمِ فانی میں میٹھی نیند سونے والو! میری سمع خراشی معاف، برکت کا ہاتھ میرے سر پر رکھو، دعا دو اور رخصت ہو۔

تمدن ۱۹۱۲ء

میں نے اس وقت میر صاحب کی رائے سے اتفاق کر لیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ تجویز اور روپیہ کی قلت "تربیت گاہ" کی ترقی کو محدود کر رہی ہے۔ لیکن زیادہ نہیں ایک تین ہی سال بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ حقیقتاً میر صاحب کی رائے صحیح تھی۔ اگر "تربیت گاہ" میری خواہش کے اصلی پیمانے پر پہونچ جاتی تو چند ہی روز میں اپنا فانی جلوہ دکھا کر ختم ہوتی۔ مسلمان اپنی یتیم بچیوں کی گریہ وزاری کا مضحکہ ہنس ہنس کر اڑاتے مگر اپنے طاقتور ہاتھوں سے ایک ٹکڑا اٹھا کر دینا نصیب نہ ہوتا۔ وہ "تربیت گاہ" کے جنازہ میں خوش و خرم شریک ہوتے لیکن مرض الموت میں دوا کے دو گھونٹ بھی ان کو پلانے میسّر نہ ہوتے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں مرنے والے جالب کی اس رائے کا شکریہ ادا کر سکوں۔ اس مرحوم نے گو میری اُمنگیں دبا دیں اور میری توقعات مٹا دیں مگر یہ اسی کا طفیل ہے کہ "تربیت گاہ" کی جماعتیں پانچ سے اور بچیوں کی عمر کی قید گیارہ سے آگے نہ بڑھی۔ لیکن مصارف کا قدم بھی آمدنی کی حدود سے باہر نہ اٹھا۔ اور "تربیت گاہ" کا سب سے اہم شعبہ یتیم سیکشن اطمینان سے اپنا پیٹ بھر رہا ہے۔ اور اپنے محسنوں کے گیت گا رہا ہے۔

میر بشارت علی جالب عمر میں مجھ سے بڑے نہ تھے۔ مگر میں سمجھتا ہوں ہندوستان میں کوئی سید مرحوم کی واقفیت کو نہیں پہنچا۔ ان کو جہاں علوم مشرقی و مغربی میں ید طولیٰ حاصل تھا، وہاں تیراکی پہلوانی کے ہنروں سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ وہ جس طرح سر علی امام کے ہاں کھانے کی میز پر (جہاں وہ اور میں دونوں مدعو تھے) مخلوط انتخاب کے سلسلے میں ایسی جامع بحث کر رہے تھے کہ حاضرین متحیر تھے۔ اسی طرح دلی کے مشہور پتنگ باز مرزا فخرو سے بھی اونچے پیچ پر ایسی تقریر کر سکتے تھے کہ سننے والے دنگ ہوں۔

کو رو چکی مگر میں آج بھی رو رہا ہوں اور جب تک زندہ ہوں روؤں گا۔ ان کی زندگی تک "تربیت گاہ" ان کی دست نگر تھی اور اس وقت یہ تربیت گاہ کے محتاج ہیں جس طرح انہوں نے اپنا فرض انسانیت ادا کیا اسی طرح یتیم بچیاں اپنا حق ادا کر رہی ہیں۔ اور ہر روز اپنا ناچیز تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرتی ہیں۔

ان دونوں کے بعد میر جالب کی رحلت تربیت گاہ کے واسطے ناقابل تلافی مصیبت ہے۔ میں اس وقت بھی صبر کرتا اور اپنے خود غرض نالوں سے ناظرین کی سمع خراشی نہ کرتا۔ مگر میر جالب مرحوم "تربیت گاہ" کی تعمیر میں اسوقت میرے شریک تھے۔ جب اس کا خاکہ میرے ذہن میں اور اس کا وجود میرے دل میں تھا۔ کہنے کو بورڈ بھی تھا اور دکھانے کو سکرٹری اور منیجر بھی مگر تجویز کو عملی صورت میں لانے والی اور خیال کو حقیقت بنا دینے والی ذات میر جالب ہی کی تھی۔ سب سے پہلی لڑکی جو "تربیت گاہ" میں داخل ہوئی وہ میر صاحب کی بھانجی تھی۔ اور سب سے پہلا شخص جو "تربیت گاہ" کی مالی ضرورتوں میں خاموشی سے شریک ہوا وہ میرا بھائی جالب تھا۔ اگر جالب مرحوم کے اس زرّیں مشورے پر میں عمل نہ کرتا کہ جو کچھ کرنا ہے خود کرو یہ کمیٹی اور بورڈ منیجر اور سکرٹری لغو اور نمائشی چیزیں ہیں تو یقیناً تربیت گاہ ایک آدھ ہی سال میں ختم ہو جاتی۔ یہ میر صاحب ہی کا فیصلہ تھا کہ چندہ کی تحریک عام نہ ہو سیاست مسلمانوں پر اس درجہ غالب آ چکی کہ ان کے کان اور آنکھیں اس کے سوا سننا چاہیں نہ دیکھنا۔ اعانت کی توقع صرف اپنے ناظرین سے رکھو۔ اور اعلان کر دو کہ جو حضرات میرے کام اور میری ذات پر بھروسہ کرتے ہیں، صرف وہ شریک ہوں۔ ورنہ لکھ لو کہ مسلمان تعمیر سے زیادہ فن تخریب کے ماہر ہیں۔

میں نے اس وقت میر صاحب کی رائے سے اتفاق کر لیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ تجویز اور روپیہ کی قلت "تربیت گاہ" کی ترقی کو محدود کر رہی ہے۔ لیکن زیادہ نہیں ایک تین ہی سال بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ حقیقتاً میر صاحب کی رائے صحیح تھی۔ اگر "تربیت گاہ" میری خواہش کے اعلیٰ پیمانے پر پہونچ جاتی تو چند ہی روز میں اپنا فانی جلوہ دکھا کر ختم ہوتی۔ مسلمان اپنی یتیم بچیوں کی گریہ وزاری کا مضحکہ ہنس ہنس کر اڑاتے مگر اپنے طاقتور ہاتھوں سے ایک ٹکڑا اُٹھا کر دینا نصیب نہ ہوتا۔ "تربیت گاہ" کے جنازہ میں خوش و خرم شریک ہوتے لیکن مرض الموت میں دوا کے دو گھونٹ بھی ان کو پلانے میسر نہ ہوتے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں مرنے والے جالب کی اس رائے کا شکریہ ادا کر سکوں۔ اس مرحوم نے گو میری اُمنگیں دبا دیں اور میری توقعات مٹا دیں مگر یہ اسی کا طفیل ہے کہ "تربیت گاہ" کی جماعتیں پانچ سے اور بچیوں کی عمر کی قید گیارہ سے آگے نہ بڑھی۔ لیکن مصارف کا قدم بھی آمدنی کی حدود سے باہر نہ اٹھا۔ اور تربیت گاہ کا سب سے اہم شعبہ یتیم سیکشن اطمینان سے اپنا پیٹ بھر رہا ہے اور اپنے محسنوں کے گیت گا رہا ہے۔

میر بشارت علی جالب عمر میں مجھ سے بڑے نہ تھے۔ مگر میں سمجھتا ہوں ہندوستان میں کوئی سید مرحوم کی واقفیت کو نہیں پہنچا۔ ان کو جہاں علوم مشرقی و مغربی میں ید طولیٰ حاصل تھا، وہاں تیراکی پہلوانی کے ہنروں سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ وہ جس طرح سر علی امام کے ہاں کھانے کی میز پر (جہاں وہ اور میں دونوں مدعو تھے) مخلوط انتخاب کے سلسلے میں ایسی جامع بحث کر رہے تھے کہ حاضرین متحیر ہو سکتے تھے۔ اسی طرح دلی کے مشہور پتنگ باز مرزا فخرو سے بھی اوپر کے پیچ پر ایسی تقریر کر سکتے تھے کہ سننے والے دنگ ہوں۔

کو رو چکی مگر میں آج بھی رو رہا ہوں اور جب تک زندہ ہوں روؤں گا۔ ان کی زندگی تک "تربیت گاہ" ان کی دست نگر تھی اور اس وقت یہ تربیت گاہ کے محتاج ہیں جس طرح انہوں نے اپنا فرض انسانیت ادا کیا اسی طرح یتیم بچیاں اپنا حق ادا کر رہی ہیں۔ اور ہر روز اپنا ناچیز تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرتی ہیں۔

ان دونوں کے بعد میر جالب کی رحلت تربیت گاہ کے واسطے ناقابل تلافی مصیبت ہے۔ میں اس وقت بھی صبر کرتا اور اپنے خود غرض نالوں سے ناظرین کی سمع خراشی نہ کرتا۔ مگر میر جالب مرحوم تربیت گاہ کی تعمیر میں اسوقت میرے شریک تھے۔ جب اس کا خاکہ میرے ذہن میں اور اس کا وجود میرے دل میں تھا۔ کہنے کو بورڈ بھی تھا اور دکھانے کو سکرٹری اور منیجر بھی مگر تجویز کو عملی صورت میں لانے والی اور خیال کو حقیقت بنا دینے والی ذات میر جالب ہی کی تھی۔ سب سے پہلی لڑکی جو "تربیت گاہ" میں داخل ہوئی وہ میر صاحب کی بھانجی تھی۔ اور سب سے پہلا شخص جو تربیت گاہ کی مالی ضرورتوں میں خاموشی سے شریک ہوا وہ میرا بھائی جالب تھا۔ اگر جالب مرحوم کے اس زرّیں مشورے پر میں عمل نہ کرتا کہ جو کچھ کرنا ہے خود کرو یہ کمیٹی اور بورڈ منیجر اور سکرٹری لغو اور نمائشی چیزیں ہیں تو یقیناً تربیت گاہ ایک آدھ ہی سال میں ختم ہو جاتی۔ یہ میر صاحب ہی کا فیصلہ تھا کہ چندہ کی تحریک عام نہو سیاست مسلمانوں پر اس درجہ غالب آچکی کہ ان کے کان اور آنکھیں اس کے سوا سننا چاہیں نہ دیکھنا۔ اعانت کی توقع صرف اپنے ناظرین سے رکھو۔ اور اعلان کر دو کہ جو حضرات میرے کام اور میری ذات پر بھروسہ کرتے ہیں صرف وہ شریک ہوں۔ ورنہ لکھ لو کہ مسلمان تعمیر سے زیادہ فن تخریب کے ماہر ہیں۔

تو یہاں بہت سے حقدار ہیں اور تمہارا وہاں مجھ سے زیادہ حقدار کون ہے۔ ایسا نہ کرنا دلی پر حرف آئے گا۔ جس طرح ہر صاحب کمال زندگی بھر پریشان رہا اسی طرح میر صاحب کی کبھی زمانے نے قدر نہ کی۔ اور ان کو زندگی کی کشمکش سے بہت کم اطمینان نصیب ہوا۔ یہاں تک کہ بزم شاہجہاں آباد کی یہ آخری شمع بھی دنیائے ادب کو اپنا جلوہ دکھا کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی کاش میر صاحب کے ماتم کرنے والے ان کے صاحبزادے سید عشرت حسین اور ان والدہ محترمہ کی کچھ خدمت کر سکتے اور میر صاحب کی موت کو ان کے ساتھ دلی ہمدردی کے مقررہ الفاظ پر ختم نہ کر دیتے۔

ہماری دلی دعا ہے کہ خداوند کریم میر صاحب کو جوار رحمت میں جگہ اور پسماندگان کو صبر عطا فرمائے اور ہمارا یقین ہے کہ تربیت گاہ بنات دہلی کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ صاحب سحر البیان میر حسن دلی کا پہلا جواہر ریزہ تھا جو لکھنؤ کی خاک میں سو رہا ہے اور مدیر عصمت میر جالب دلی کا دوسرا ہیرا ہے جس کو لکھنؤ کی خاک نے اپنی گود میں ابدی نیند سلا دیا۔

عصمت ستمبر ۱۹۳۰ء

علمی یا معاشرتی کوئی ایسا ہی بدنصیب فن ہوگا جس کی تاریخ پر میر صاحب کو عبور نہ ہو۔ ہندو یا مسلمان مشکل سے کوئی ایسا لیڈر ہوگا جس کی سات پشتوں سے میر صاحب باخبر نہ ہوں۔ اس بڑھاپے میں بھی کہ فکر معاش نے دم بھر کو ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ اپنا کوئی لمحہ ضائع نہ کرتے اور ہر وقت کتاب ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ ان کا کتب خانہ ان کے علمی ذوق وشوق کا پتہ دے رہا ہے۔ اس دورِ پرآشوب میں کہ مسلمان اپنے درخشندہ جوہر کھو بیٹھے۔ میر صاحب وہی نصف صدی پیشتر کے مسلمان تھے۔ بہن بھانجیوں کے حقوق، غریب عزیزوں کے ساتھ سلوک آج بھی میر صاحب کی چار دیواری میں نظر آرہے تھے۔ اسلامی روایات جن کا خاتمہ ہوچکا میر صاحب کے گھر میں موجود تھیں۔ وہ اس قدر مہمان نواز تھے کہ ان کے دسترخوان سے انسانوں کے علاوہ کتے بلی اور پرندبھی اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ ان کی مالی حالت بہت اچھی کیا کچھ بھی اچھی نہ تھی۔ لیکن میں نے ان کو تنہا کھانا کھاتے نہ دیکھا انکسار اس قدر تھا کہ ایک طرف وہ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف کنجڑے اور کباڑیئے کی دوکان پر (صرف اس لئے کہ بچپن کے تعلقات ہیں) بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔

میر صاحب دلّی کے متوطن ہی نہیں دلّی کے دلدادہ تھے۔ اور ان کا عشق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ یہ تک گوارا نہ کرسکتے تھے کہ لکھنؤ کی بالائی دلّی سے بہتر ہوتی ہے آخری مرتبہ جب وہ چند گھنٹے کیواسطے دلّی آئے تو اپنی بہن کے ہاں ٹھیرے۔ چند منٹ کے واسطے میرے پاس تشریف لائے تو میں نے شکایت کی اور کہا کہ میں بھی اگر کبھی لکھنؤ آیا تو کسی اور کے ہاں ٹھیروں گا۔ میر صاحب خفا ہوگئے اور فرمانے لگے "میرے

ظرافت کسی جگہ نہ ٹھٹکا عمر کی ترقی کے ساتھ اُن کا جسدِ خاکی رو بہ فنا ہوا۔ مگر اُن کا دل و دماغ حدودِ شباب میں سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اور یہ ایک ایسا امتیاز تھا جو کم آدمیوں کو نصیب ہوتا ہے۔

خان بہادر سید ناصر علی کی زندگی ہم کو اساتذہ کی جیتی جاگتی تصویر دکھا دیتی تھیں۔ اُن میں ذوق کی سنجیدگی، غالب کی تنک مزاجی اور داغ کی شوخیوں کی ایسی جھلکیں موجود تھیں کہ میں نے کئی مرتبہ اُس کا لطف اٹھایا۔ میری پہلی ملاقات خان بہادر مرحوم سے شاید ۱۸۹۰ء میں ہوئی۔ ملاقات کیا زیارت کہنا چاہیئے۔ میرے پھوپی زاد بھائی مولوی انور حسین مرحوم کی شادی اُن کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ میں بھی بارات میں شامل تھا۔ بھائی انور مرحوم کی شادی کے ساتھ ایک اور لطیفہ یاد آگیا۔ خاندان کے شادی بیاہوں کے رقعے شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم لکھا کرتے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور مولانا مرحوم "انجمن حمایت الاسلامؒ" کے لکچر کی تیاری کر رہے تھے۔ خاندان ہی میں ایک اور بزرگ بھی تھے۔ تھے توجیّد عالم مگر خدا ان کی رُوح کو نہ شرمائے یہ خبط سما گیا تھا کہ مجھ سے بہتر شاعر شہر بھر میں کیا ہندوستان بھر میں نہیں ہے۔ اُنہوں نے اس شادی کا رقعہ لکھا۔ افسوس مجھے اُس کا صرف ایک شعر یاد ہے، اس قدر اور ملحوظ رہے کہ خان بہادر سید ناصر علی کے والدِ مرحوم کا نام مولوی سیّد ابوالمنصور تھا۔ اب بزرگ خاندان کا شعر ملاحظہ ہو، یہ رقعہ کا ایک شعر ہے ۔

وہ منصور علی مرجعِ خاص و عام کہ آتا نہیں بحر میں جن کا نام

یہ رقعہ مولوی نذیر احمد صاحب کی خدمت میں بھی پہونچا جب اُسکی خوب ہنسی اُڑ چکی تو عمّ مرحوم نے خود رقعہ لکھا، افسوس اُس کے بھی مجھے

جہان آباد کا گوہرِ درخشندہ

چمنستانِ جہان آباد کی بہار جو ۱۸۵۷ء میں اُجڑ چکی تھی۔ علم و فضل جن کے قدم چومتا تھا، کمال جن کے روبرو دست بستہ تھا، دتیں ہوئیں رخصت ہو چکے تھے۔ مگر اُن کی متبرک صورتوں کو دیکھنے والی آنکھیں اب تک کھلی ہوئی تھیں جن کے ٹھنڈے سانس، مٹنے والوں کی یاد میں کبھی کبھی دو آنسو گرا لیتے تھے۔ اب وہ بھی بند ہو رہی ہیں۔ اور جن سدا بہار پھولوں کی شمیم انگیزیاں رستہ چلیتوں کے دل مسخر کر لیتی تھیں، صحبتِ شب نے جن کو پارس اور جمال ہمنشیں سے جن کو کندن بنا دیا تھا اُن کے بھی چل چلاؤ کا وقت آ گیا۔ اور آج ہم کو جہانِ ادبیاتی بزم فانی کے اُس گوہرِ درخشندہ کو وداع کرنا ہے جو ناصر علی کی ہیئت، میں ہمارے سامنے جلوہ گر تھا۔ جس کے قلم نے موتی لٹائے اور زبان نے پھول برسائے۔ جو کل تک ہمارے ساتھ تھا اور آج ابدی نیند سو رہا ہے۔

سید ناصر نذیر کے فراق نے خون کے آنسو رلوا دیئے۔ دلی کی وضعداری اُن کے ساتھ ختم ہوئی۔ ابھی آنکھیں ان کی صورت کو اور دل اُن کی یاد میں تڑپ رہا تھا کہ خان بہادر سید ناصر علی صاحب بھی ہمیشہ کو بچھڑ گئے۔ انہوں نے اُردو ادب کی حقیقی خدمت کی ہے۔ اور جو روش شروع کی تھی آخر تک اُس پر قائم رہے۔ اُن کی تحریر میں باوجود انحطاطِ قویٰ اور اضمحلال کے ہمیشہ شگفتگی رہی اور زندگی کے آخری وقت میں بھی ان کا توسنِ

چلے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوا خان بہادر سید ناصر علی صاحب یہی ہیں۔
یہ پہلی ملاقات یا زیارت کی کیفیت ہے۔

دوسری ملاقات اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے اور وہ اس طرح
کہ عصمت کے ایک نامہ نگار میری ملاقات کو بمبئی سے تشریف لائے اُنہوں نے
خان بہادر صاحب سے ملنے کا شوق ظاہر کیا اور یہ بھی خواہش کی کہ میں
اُن کے ساتھ چلوں۔ چنانچہ میں اُن کے ساتھ گیا۔ گرمی کے دن تھے، اور
چار بجے کا وقت۔ اطلاع کی، طلبی ہوئی، اوپر گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ خان بہادر
صاحب کھدر کی مرزئی پہنے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ بجلی کا
پنکھا اُس وقت تک عام نہیں ہوا تھا مگر وہاں نہ فراشی پنکھا تھا نہ ہاتھ کا
پنکھا۔ خان بہادر صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہی فرمایا "ارشاد"؟
نامہ نگار صاحب نے پانچ روپے سامنے رکھے اور کہا "صلائے عام جاری
فرما دیجئے"۔ خان بہادر صاحب نے اُن کی صورت دیکھی اور دو سوال کئے
"وطن"؟ اور "مشغلہ" اُس کے بعد فرماتے ہیں "تم پرچہ لے کر کیا کرو گے صلائے
عام تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتا" اس کے بعد مجھ سے فرمایا "تمہارا کیا نام ہے"؟
میں نے نام بتایا "ہاں تم سمجھ سکتے ہو" خیر پرچہ تو جاری ہو گیا مگر اس گفتگو میں
نامہ نگار صاحب کو بھی مزہ آگیا اور اب بھی جب کبھی خیال آتا ہوگا تو ضرور
اُس کا لطف اٹھا لیتے ہوں گے۔

تیسری ملاقات بھی کچھ کم پُر لطف نہیں۔ عزیزوں میں سے ایک صاحب
نے اپنے داماد کی تشریف آوری کے سلسلے میں خاندان کے بعض افراد کو کھانے

دو تین ہی شعر یاد ہیں۔ غالباً میاں اسعد الاشرفی کو سب یاد ہوں گے۔
یہ یاد رہے کہ اُس وقت کے رقعوں کا عنوان اکثر یہ شعر ہوتا تھا ؎

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

مولوی نذیر احمد صاحب فرماتے ہیں ؎

ہمہ داں حامیٔ دیں مولوی ابوالمنصور | جنکے افضال سے آگاہ ہیں نزدیک بعید
اُن کا دولتکدہ ہے بزم گہہ عقدِ نکاح | کہ وہ خود جائے مبارک ہے مگر فالِ سعید
نہ زامیر نہ باجا نہ سرود اور نہ رقص | اور نہ بدعت کے مراسم سے کوئی امر جدید
عقد کے دوسرے دن ہوگا ولیمہ کا طعام | جو میسّر ہو زنان و نمک و آشش ثرید

آپ اگر لائیں گے تشریف براہِ شفقت
میں یہ سمجھوں گا کہ بے دام لیا مجکو خرید

یہ رقعہ اس مضمون سے زیادہ متعلق نہیں۔ اس لئے پھر فراشخانہ میں چلنا چاہیئے۔ جہاں بارات بیٹھی ہوئی ہے۔ دلّی میں اس وقت قاعدہ یہ تھا کہ جب دلہن رخصت ہوتی تھی تو دولہا خُسر کی خدمت میں سلام کو جاتا تھا اور سلامی لیکر رخصت ہوتا تھا۔ خان بہادر صاحب نے اس رسم کو جائز نہ سمجھا یا یوں کہو کہ داماد کو آنے کی اجازت نہ دی۔ دولہا کے ماموں اور میرے چچا خان بہادر مولوی عبدالحامد صاحب نے کہلا کر بھیجا کہ اجازت ہو تو میں ملاقات کے لئے حاضر ہوں، اس کا جواب یہ آیا کہ "آپ میری طبیعت سے واقف نہیں، میں آپ کے مذاق سے آشنا نہیں۔ آپ دولہا کے ماموں ضرور ہیں، مگر اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ آپ میرا اور اپنا دونوں کا وقت ضائع کریں"۔
جب بارات چلی تو ہم نے دیکھا کہ ایک صاحب کھدر کا کرتہ پہنے سپر سپر کرتے

آخری ملاقات میری ایک بزمِ میلاد میں ہوئی۔ میں نے اپنی عمر میں بڑے بڑے غیر معقول واعظ دیکھے ہیں۔ ایک مولوی صاحب کو یہاں تک بیان کرتے سُنا ہے اور کسی گھر میں نہیں، بیچ بازار میں جامع مسجد کے نیچے کہ "حجّاج بن یوسف نے اکبر پر حملہ کیا"۔ مگر یہ مولود خواں اُن سے بھی بڑھا ہوا تھا جس نے شروع سے آخر تک کلام اللہ کی آیتوں کے سوا ایک بات بھی سچ نہ کہی۔ مگر میں اُس وقت بھی متعجب تھا اور آج بھی کہ خان بہادر صاحب یہی فرماتے رہے کہ "سچ کہتا ہے۔ سچ کہتا ہے"۔

آج کی دنیا میں بہت کم افراد ایسے ہوں گے جو خان بہادر مرحوم کی اس طبیعت کا لطف اٹھائیں۔ مگر خاکِ جہان آباد ایسی بہت سی ہڈیاں اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے کہ اُنکا صداقت ہر روز طواف کرتی ہے۔ پابندیِ وضع اور صفائی قلب عمر بھر اُن کی چیلیاں رہیں اور تصنّع اور نفاق اُن سے ہزاروں کوس دور رہے۔ اُن کی کتابِ زندگی کا ہر صفحہ اور صفحہ کی ہر سطر پڑھنے والوں کو سچائی کے معنی بتا رہی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی گردنیں زندگی اور زندگی کی کسی ضرورت کے سامنے خم نہ ہوئیں۔ شاہ و گدا اُن کے سامنے ایک تھے۔ مگن رہے اور مطمئن گئے۔

ضرورت ہے کہ خان بہادر مرحوم کے واقعات حقیقت کی کسوٹی پر پرکھیں جائیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت کے تعلقات جن کی بنیادیں مکرو ریا کے ان الفاظ پر قائم ہیں (Very glad. Very sorry) اس سچائی اور صفائی کے مقابلے میں کیا وزن رکھتے ہیں۔ بہر حال سیدنا صر علی رخصت ہوئے اور اب اُن کے واسطے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی آرزو نہیں کہ جس طرح چمنستانِ ادب کا یہ باغبان "صلائے عام" میں زبان کے پھول برسا گیا معبودِ حقیقی اُسکی روح پر ایسے ہی پھول برسائے۔

ساقی۔ ستمبر ۳۳ء

پر جمع کیا۔ یہ داماد بھی باعتبار وجاہتِ ظاہری خان بہادر صاحب سے کئی لفظ آگے تھے۔ مجمع مختصر تھا مگر کٹر مولویوں کا۔ دسترخوان پر کوئی شخص لیا نہ تھا جس کی ڈاڑھی شرعی نہ ہو۔ خان بہادر صاحب تشریف لائے اُن کے ساتھ ایک آٹھ نو برس کا لڑکا تھا یہ مجھے خبر نہیں کہ پوتا تھا یا نواسا۔ انہوں نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور شاید میں ہی سب سے زیادہ گنہگار نظر آیا کہ ہر طرف سے ان صداؤں کے باوجود کہ "ادہر تشریف لایئے" سب کو چھوڑ چھاڑ میرے پاس آ بیٹھے۔ اُن سے کھانے کے واسطے کہا گیا تو صاف انکار کر دیا اور فرمایا "نہ میں کہیں جاؤں نہ کھانا کھاؤں"۔ صاحبِ خانہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "انہوں نے کہا کہ بیٹی کا معاملہ ہے میں چلا آیا۔ اس لڑکے کو اسی واسطے لے آیا ہوں کہ کھانے میں شریک ہو جائے" بچہ کھانے میں شریک ہوا خان بہادر صاحب جب تک بیٹھے اُن کا روئے سخن میری ہی طرف رہا جب جب لڑکا کھانا کھا چکا اور ہاتھ روک کر پانی پینے لگا تو خان بہادر صاحب نے فرمایا" دیوانہ ہوا ہے۔ عالموں کا گھر، مولویوں کا دسترخوان، رکابی اس طرح سے چاٹ کہ ٹس تک نہ رہے"۔ اس کے بعد مجھ سے فرمایا "کیوں حضرت مکّہ میں جھاڑو دینی آسان تھوڑی سی ہے"۔ اب جو داماد صاحب کی شامت آئی تو اس لئے کہ خود بھی خطاب یافتہ تھے۔ دریافت کرنے لگے کہ فرصت کا وقت کونسا ہے کل میں بھی حاضر ہوں"۔ "تشریف لا کر کیا کیجئے گا اور کس مسئلہ پر بحث کیجئے گا۔ یہ وقت کسی ایسے شخص کے پاس گذاریئے جو آپ کے مذاق کا ہو۔ خود بھی محظوظ ہو اور آپ کو بھی خوش کرے"۔ اب تمام مجلس میں سناٹا تھا اور سب ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

گذرے وقت میں بھی ہو چکے ہیں۔

ذیابیطس کا مرض جس میں لمحہ بہ لمحہ پیشاب آتا رہتا ہے اس درجہ ترقی کر چکا تھا کہ ان کی ایک آنکھ قریب قریب ضائع ہو چکی تھی۔ پاؤں پر ورم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری جو اُن کا علاج کر رہے تھے انہوں نے صاف کہدیا تھا کہ جب تک تم کو سکون میسر نہ ہوگا صحت نہیں ہو سکتی۔ مگر مرحوم محمد علی کا یہ حال تھا کہ مسلمانوں کی مصیبت لمحہ بھر کی بھی مہلت نہ دیتی تھی۔ چنانچہ جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور ڈاکٹر انصاری نے بھی یہی مشورہ دیا کہ شملہ چلے جاؤ مگر خدا کے لئے سب کام چھوڑ دو اور دل و دماغ کو چند روز کے واسطے آرام دو تو سر یعقوب ایک صبح کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

میں صبح کے وقت ملنے گیا تو ملازم نے کہا طبیعت خراب ہے رات بھر جاگے ہیں۔ اس وقت ذرا آنکھ لگ گئی ہے۔ میں کارڈ چھوڑ کر واپس ہو رہا تھا کہ آواز آئی۔

"یعقوب۔ یعقوب۔ اوپر آجاؤ۔"

میں اُوپر گیا تو وہ پلنگ پر بیٹھے تھے۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ ہاتھ میں تھی کہنے لگے۔

"دو بجے رات تک اس کو پڑھتا رہا۔ اس کے بعد دورہ پڑ گیا اب پھر پڑھ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں ختم کر لوں گا۔ گھنٹہ بھر تک نہایت گرمجوشی سے جیسی اُن کی عادت تھی رپورٹ پر گفتگو کرتے رہے۔ رات کو پھر دورہ پڑا۔"

تمام ڈاکٹروں نے سمجھایا زیادہ نہیں چند روز کے واسطے گوشہ نشین ہو جاؤ۔ مگر یہ اسلام کا شیدا مسلمانوں کی گالیاں کھاتا رہا۔ اور ان ہی پر قربان گیا۔

لارڈ اروِن وائسرائے ہند اس وقت شملہ پر موجود تھے۔ انہوں نے مولانا محمد علی مرحوم کا حال سُنکر اپنا خاص ڈاکٹر ان کے دیکھنے کو بھیجا۔ اس

مولانا محمد علی مرحوم

حضرت علامہ مغفور نے مولانا محمد علی کی یاد میں یہ مضمون علالت سے ایک ماہ اور انتقال سے سوا تین ماہ قبل اکتوبر ۳۵ء میں تحریر فرمایا تھا۔

مولانا محمد علی مرحوم جو مجھکو ہمیشہ "دکھیا" کہا کرتے تھے اور تربیت گاہ میں اکثر تشریف لاکر عزت بڑھاتے تھے جن کا دل اسلام کے واسطے رات دن تڑپتا تھا جن کو مجھ سے اور بیگم راشد الخیری سے اس قدر محبت تھی کہ سال میں ایک دو دفعہ کبھی خود کبھی مولانا شوکت علی اور دوسرے احباب کے ہمراہ نہاری کی فرمایش کرتے اور کھانے کے بعد فرماتے "ارے بھئی ہماری بہن کہاں ہیں۔ لو! جس محبت سے تم نے کھلایا اُسی شوق سے ہم نے کھایا"۔ دو تین روز سے مجھے بہت ہی یاد آرہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ محمد علی کی موت سے جو نقصان مسلمانوں کو ہوا وہ آسانی سے پورا نہ ہوگا۔ وہ مسلمانوں کا عاشق جری بے لوث صادق اور ایسا مخلص مسلمان تھا کہ اسلام کی تمام خوبیاں اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس نے اپنی زندگی میں یہ لفظ کہدئے تھے "ہندوستان مردہ پرست ہے اس نے زندگی بھر مجھ پر لعن طعن کی اور بُرا بھلا کہا مگر مرنے کے بعد مجھے یاد کریں گے اور روئیں گے لیکن میرا دل اس قدر پک گیا ہے کہ میں ان کے ہاں مروں گا بھی نہیں" اسکی خواہش پوری ہوئی، اس کا کہنا صحیح ہوا اور اس کی دعا قبول ہوئی۔ میں اُن کی روح کو فاتحہ کا ثواب پہونچا کر آخر وقت کے مختصر حالات لکھتا ہوں کہ لڑکیاں اپنے محسن کو یاد رکھیں۔ اور اُن کو معلوم ہو کہ اسلام کے کیسے عاشق نار اس گئے

صغریٰ بیگم کی یاد

دہلی سے گیارہ میل کے فاصلے پر قصبہ مہرولی ہے، جس کو قطب صاحب اور خواجہ صاحب بھی اس لئے کہتے ہیں کہ وہاں قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ قطب مینار یعنی قطب صاحب کی لاٹھ اسی جگہ واقع ہے۔ یہاں کا چپہ چپہ تاریخ کا دفتر ہے، اور قدم قدم پر جلیل القدر بادشاہوں اور بزرگوں کی قبریں اور مزارات ہیں ایک قطب مینار ہی نہیں بیسیوں پرانے زمانے کی عمارتیں اپنے مالکوں اور مکینوں کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ اولیا مسجد، شمسی تالاب، شیخ کا مقبرہ، غرض یہ جگہ ہے جہاں میلوں اور کوسوں خزانے دفن ہیں جن کی نظیر سرزمین ہند پر مشکل سے ملیگی ؎

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

یوں تو دلی دروازے سے باہر نکلتے ہی کھنڈر شروع ہو جاتے ہیں، اور نظر اُن کچی پکی قبروں اور ٹوٹے پھوٹے مزاروں پر پڑتی ہے، جس کے بسنے والے علم و فضل اور زہد و اتقا کے ڈنکے بجا گئے۔ مہندیوں میں مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا وہ خاندان آرام کر رہا ہے جس نے متواتر چھ نسلوں تک ایسے جید عالم پیدا کئے، کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ سلطان جی میں حضرت نظام الدین اولیا، حضرت امیر خسرو جیسی باکمال ہستیاں مصروفِ خواب ہیں۔ اِدھر ہمایوں اُدھر صفدر جنگ، المختصر دور تک یہ سلسلہ اسی طرح

ڈاکٹر کا آنا قیامت سے کم نہ تھا۔ مسلمانوں نے ہزار ہا صلواتیں سنانی شروع کیں کافر، بے ایمان باغی، مجنوں، مکار، غرض بدتر سے بدتر الفاظ استعمال کئے۔ یہاں تک کہدیا کہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے اور ہماری آنکھوں میں خاک جھونک رہا ہے۔

ان باتوں کا اثر صداقت کے اس پتلے پر یہ ہوا کہ وہ اسی حالت میں مسلمانوں کے حقوق پر لڑنے کیلئے سات سمندر پار ولایت پہونچا اور وہیں دنیا سے رخصت ہوا۔ سفر کے وقت کی کیفیت یہ تھی۔

جس وقت محمد علی کو اسٹریچر پر لٹا کر جہاز میں لے گئے اسوقت کا نظارہ بہت ہی درد انگیز تھا۔ ہر شخص کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ گویا زندہ جنازہ جا رہا ہے۔ ایک صاحب نے سوال کیا آپ اس حالت میں اسقدر لمبا سفر کیوں کر رہے ہیں تو آپ نے ہنس کر جواب دیا:۔ "مرنے کے لئے"

ایک صاحب کا بیان ہے کہ جب آخر وقت میں حاضر ہوا تو خون کی قے کر رہے تھے۔

ولایت کی ایک تقریر میں فرماتے ہیں "ایک انگریز پرنس نے میرے ڈاکٹر سے پوچھا کہ بڑے میاں کو کیا شکایت ہے۔ تو ڈاکٹر نے جواب دیا" یہ پوچھو کہ کیا شکایت نہیں ہے "۔

اسی تقریر میں ارشاد ہوتا ہے " دل کی حالت خراب ہے، بینائی درست نہیں، پاؤں سوجھ رہے ہیں، ذیابیطس موجود ہے۔ یہ وہ بیماریاں ہیں جن کے ہوتے ہوئے ایک سمجھدار آدمی سات میل مشکل سے سفر کر سکتا ہے۔ میں نے سات ہزار میل کا سفر کیا ہے۔ کیا کروں جہاں ہندوستان اور مسلمانوں کا معاملہ آجاتا ہے میری عقل زائل ہو جاتی ہے"۔ اس وقت محمد علی مسلمانوں کی ایک آخری شمع تھی۔ جو ہزاروں کوس پر جھلملا رہی تھی۔ چمنستان اسلام کا وہ پھول تھا جسکو خزاں کے ہاتھ مرجھانیوالے تھے۔ موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ اور وہ اپنے بھائیوں پر نثار ہو رہا تھا۔ ان بھائیوں پر جنہوں نے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کو یاد دلا دیا۔

جس صبح کو محمد علی کی روح نے مفارقت کی ہے وہ رات بھر اپنی قوم کا کام کرتا رہا اور وہ رپورٹ تیار کر لی جو وزیر اعظم کے پاس بھیجنی تھی۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس بیوی کی کیفیت کا جو محمد علی جیسے شوہر کو مردہ دیکھ رہی تھی اس بھائی کی حالت کا جس کے یہ الفاظ تھے۔

" محمد علی میرا بھائی بھی ہے۔ میرا بیٹا بھی اور میرا عاشق بھی"۔ قوت کا زبردست ہاتھ محمد علی کو جدا کرنے کیواسطے آگے بڑھا اور آخر وہ لمحہ آپہونچا کہ مسلمانوں کا یہ عاشق زار ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے دنیا سے رخصت ہوگیا۔

وہ انگریزی نہ جانتی تھیں مگر فارسی بہت اچھی تھی۔ گلستاں، بوستاں، سکندرنامہ شاہنامہ حفظ تھا۔ کلام اللہ کی حافظ نہ تھیں مگر مشکل سے ممکن تھا کہ ان کے سامنے کوئی غلط قرآن شریف پڑھے اور وہ نہ ٹوکیں۔

نماز روزہ کی سختی سے پابند تھیں۔ رمضان بھر مساجد کی افطاریوں کے علاوہ نہ معلوم کتنی عورتیں ان ہی کے ہاں روزہ کھولتی اور کھانا کھاتی تھیں۔

جو چیز آج کانفرنسوں اور انجمنوں اور ریزولیشنوں سے حاصل نہیں ہوتی، وہ ان کے دم سے اس طرح پوری ہوتی تھی، کہ غریب عزیزوں کی مقررہ تنخواہوں کے علاوہ محلہ میں جس شخص کو قرض کی ضرورت ہوتی تھی، وہ گردی گانٹھے سے محفوظ تھا، چیز رکھی اور روپیہ ان سے لے لیا۔ وہ بڑی جائداد کی مالک تھیں مگر جب کبھی مرمت کی ضرورت ہوتی جس قدر چونہ اینٹ مٹی آتا، پہلے اس سے کسی مسجد کی مرمت ہوتی، اس کے بعد جائداد کی۔ شہر کی ایسی مسجدیں کم ہوں گی جن کے مؤذن اور پیش امام ان کو دعائیں نہ دیتے ہوں۔

مولوی عبدالرب صاحب مرحوم جو ان کے حقیقی چچا تھے جس وقت یہاں زینور کی جامع مسجد بنوا رہے تھے وہ حیدرآباد سے دہلی آئی ہوئی تھیں۔ نقد روپیہ کے علاوہ انہوں نے اپنا تمام زیور جو کئی ہزار کی ملکیت تھا، مسجد میں دے دیا۔ اس زیور میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ وہ زیور تھا جو اُن کو میکے سے جہیز میں ملا تھا۔

عصمت سنہ ۱۹۲۶ء

چلا گیا ہے، لیکن منبع مہرولی ہی ہے، جہاں فقیر اور بادشاہ دونو خاک کی سیجوں میں دفن ہیں۔

کل ۴ مئی کو میں قطب میں تھا، دوپہر کے وقت فاختہ کی کوکو تہ خانۂ سی جنگل میں لائی، دھوپ کی چادر دور تک پھیلی ہوئی تھی، اور جہاں تک نگاہ جاتی تھی قبروں کا سلسلہ ختم نہ ہوتا تھا، ہوا گرم تھی، املی اور پیپل کے درخت مٹنے والوں کی وداع پر کہرام مچا رہے تھے، بگولے شہر خموشاں کی خاک چاروں طرف اڑاتے پھرتے تھے، اور فاختہ کی صدا ان ذرات کے گلے میں بانہیں ڈال رہی تھی۔ دوپہر کا سناٹا اس خاموش آبادی میں طاری تھا۔ مگر مردوں کی اس سنسان مجلس میں کائنات کی اکثر اشیاء موسیقی کا کمال دکھا رہی تھیں، ہوا کے ہاتھ میں ساز تھا، فاختہ غزل خواں تھی، اور پتّے رقص کر رہے تھے۔ آفتاب کی تیز شعاعوں نے مجھے دبکے دیکر نکالا اور میں شیخ کے مقبرہ پر چلا گیا۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے احاطہ میں جو مفتی والوں کا قبرستان مشہور ہے داخل ہوا تو کتبوں میں وہ نام نظر آئے جو میری آنکھوں کے سامنے زمین کا پیوند ہوئے ہیں۔ پیاری بہن صغریٰ بیگم کی قبر دیکھی، جو میری پھوپی زاد بہن اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم کی صاحبزادی تھیں۔ قبر دیکھتے ہی ان کی صورت آنکھوں کے سامنے آگئی، اور ساتھ ہی ان کی عادات و خصائل ان کی پاک زندگی، ان کا اسلام، اور ان کے کارنامے۔

صغریٰ بیگم مرحومہ کا زمانہ زیادہ دنوں کا نہیں اب ہی کا ہے۔ ان کے دیکھنے والے بیسیوں مرد اور عورتیں زندہ ہیں۔ ان کا اردو کا خط اتنا پاکیزہ تھا کہ آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں میں مشکل سے شاید دو فیصدی کا ایسا ہو،

اسی منزل گاہِ راحت و عیش میں جہاں باجے گاجے کے غل غپاڑے سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، وہاں شہر سے باہر ایک کونہ میں چھوٹا سا قبرستان بھی ہے، جس میں ٹوٹی پھوٹی پرانی قبریں ان خوشیوں کی بے ثباتی کا پتہ دے رہی ہیں! یہ مٹی ہوئی صورتیں جو آج اس سنسان میدان اور ہو کے عالم میں بے خبر پڑی ہیں، کل اسی منزل گاہ میں شاداں وفرحاں پھر رہی تھیں! فارغ البالی کے چنور اُن کے سروں پر سایہ کئے تھے۔ اور سیاراتِ استعارات پر راحت واطمینان کے پھول برسا رہی تھی۔ عزیزو! تعلقات کا اثر جیسا تم پر ہے، ایسا ہی ان پر بھی تھا۔ جس طرح تمہارے دلوں میں ارمان ہیں ان کے بھی تھے! بادِ صبا کی اٹھکھیلیاں جس طرح تمہارے ساتھ ہیں، اسی طرح ان کے ساتھ بھی تھیں، یہ ہی چاند تارے جو آج تمہارے سامنے ہیں ان کے سروں پر بھی تھے۔ قدرت کی تمام دلچسپیاں جوں کی توں ہیں، مگر اس کی بہار دیکھنے والے بدل گئے! یہ نیند کے متوالے جن کے ڈھیر پیش نظر ہیں، اس فراقِ ابدی سے خوش نہ تھے! جاگ سکیں تو ان کو اٹھاؤ، اور ان سے پوچھو کس دل سے گئے اور کس حال میں ہیں۔ بڑی طاقتور تھی وہ چیز جو اِن غریبوں کو ایسی چہل پہل سے اٹھا لائی اور اس جنگل بیابان میں لا ٹھایا۔ فاختہ کی کوکو نے ان نو وارد مہمانوں کو لوری دی، املی اور نیم کی پتیاں ان کو جھلنے لگیں۔ گویہ پیاری صورتیں ہمیشہ کو چھوٹ گئیں، ان کے شکوے شکایت سب ختم ہوئے اور اب ہمیں ان سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں مگر نہیں! کبھی تو ان کی بھی خاطر منظور تھی! زندوں کی ملاقات کا لطف تو بہت اٹھایا۔ آؤ آج ان مردوں کی صحبت میں بھی شریک ہوں۔

ملکۂ محبت

آفتاب و ماہتاب کچھ کے کچھ ہو جائیں، زبان کی رفتار میلوں اور کوسوں آگے بڑھ جائے، آسمان کروٹوں پر کروٹیں لے، اور زمین چکروں پر چکر کاٹے، مگر قانونِ قدرت کے سنگلاخ پہاڑ اپنی جگہ سے سرکنے والے نہیں چاند کی آب و تاب، تاروں کی چمک دمک سورج کی طلوع و غروب کی سمتیں جو آج سے ہزار برس پہلے تھیں، وہی آج ہیں، اور اُس وقت تک اسی طرح رہیں گی جب تک کسی ستیارہ کی ٹکر یا صانع حقیقی کا حکم ان تمام اسباب کا خاتمہ نہ کردے۔

کائناتِ دہر کے متضاد نتائج حیاتِ انسانی کی مختلف حالتیں انواع و اقسام کے تماشے، رنگ برنگ کی کیفیتیں پیش خیمہ ہیں۔ اُس انقلاب کا جو عمر کے باقی حصے میں ہونے والا ہے، اور خبریں ہیں اُس وقت کی جب جسدِ خاکی ان تغیرات سے بے تعلق ہوگا۔

یہ واقعات اگر صنعت تسلیم کر لئے جائیں تو لا جرم اس کا صانع ماننا پڑے گا، وہ نیچر ہو یا خدا۔ مگر اس استادی کے قائل ہیں کہ باعتبار ضرورت پارس بنا کر بھیجا، اور کندن بنا کر چھوڑا! کچھ ایسا دلچسپی کے سانچہ میں ڈھالا کہ اس حیاتِ ناپائیدار پر کیسی ہی تکلیفیں اور کتنی ہی پریشانیاں کیوں نہ گذریں، آفتوں پر آفتیں آئیں مصیبتوں پہ مصیبتیں ٹوٹیں چاہو کہ اس پیرِ زال کی نیرنگیوں سے دل اُکتا جائے ممکن نہیں۔

صورت شکل کی عورت ہوگی، جس کی قبر پر یہ کچھ نو برس رہا ہے۔ دو رویہ گملوں کی قطاریں، رنگ برنگ کے پھول، مقناطیسی اثر دکھا رہے ہیں۔ سرہانے سنگ مرمر کا ایک پتھر ہے، جس پر کندہ ہے:-

"ملکۂ محبت کی آرام گاہ"

سنہ ۱۹۰۸ء

دو آنسو

میاں عبدالخالق، حضرت مصور غم علیہ الرحمۃ کے منجھلے لڑکے، اٹھارہ سال کی عمر میں ۲۴ جون سنہ ۱۹۲۵ء کو داغ مفارقت دے گئے مہینہ سوا مہینہ بعد لوح تربت کے لئے بڈھے باپ نے یہ دو شعر کہے تھے

کلیجہ کی جو ٹھنڈک تھا، اور آنکھیں جس کا گہوارہ

یہ سناٹا، یہ خاموشی، اب اُسکی خوابگاہ ٹھیری

پیام مرگ تھا جس کا شباب، ہے یہ وہی بچہ

جوانی موت تھی جس کی وہ ہے یہ خالق الخیری

کیسی بارونق محفل جمی ہوئی ہے چھوٹے بڑے بڈھے جوان ایک لباس ایک وضع ایک قطع ننگے سر ننگے پاؤں اپنے اپنے کارناموں پر فخر کررہے ہیں! بہت سے خلق محبت کے بندے ہیں۔ جو اپنی بیش بہا زندگی دوسروں پر نثار کرگئے۔ گو خالی ہاتھ رہے اور خالی ہاتھ آئے، مگر ایسے خزانے اپنے ساتھ لائے جو کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ کیسے مستقل مزاج لوگ تھے، مصیبتیں جھیلیں، آفتیں بھگتیں، مفلس جئے، قلاش مرے، مگر خلوص کے لہلہاتے پھول جو ماں کے پیٹ سے لائے تھے اُنہیں نہ مرجھانے دیا۔ دیکھو اور نظر غور سے دیکھو! زندگی کا سہرا انہیں کے سر ہے! جیتے جی تو ان کی کچھ وقعت نہ تھی۔ مگر آج ان کی صورتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ بڑے بڑے عبادت گذاروں کی ٹکٹکی ان کے چہروں پر بندھی ہوئی ہے، اور یہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے! حاصل عمر دوسروں کی نذر کردیا۔ عزت کے خواہاں رہے، نہ دولت کے طالب۔ ان کی آرزو، ان کے ارمان، ان کی خواہشیں، ان کی امنگیں جو کچھ تھیں یہ تھیں کہ دوستوں کا دم بھرتے پیاروں کا نام لیتے دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ خوش نصیب تھے، یہ آپ اور غنیمت تھی ان کی زندگی۔

جنگل بسانے والو! گو ہم سے رخصت ہو گئے اور ایسے رخصت ہوئے کہ اب نظر نہ آؤ گے۔ مگر زیست تھی تو تمہاری اور انسان تھے تو تم۔ یہ چوتھی کی دُلہن، یہ حسین ملکہ جو آج سنہری کٹھرے میں تمہارے پاس آرام کر رہی ہے۔ تمہارے ہی قابل تھی۔ اب اس کے قدردان کہاں، اور پوچھنے والے کدھر۔ خدا جانے کس

شاہجہاں آباد کے عناصر اربعہ

حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بچپن اور جوانی کے دوستوں کی یاد میں یہ مرثیہ ستمبر ۱۹۳۴ء میں لکھا تھا اور رسالہ "ساقی" میں شائع ہوا تھا۔ شاہجہاں آباد کے عناصر ثلاثہ پر مصور غم نے جو آنسو بہائے تھے اہل درد کو مدتوں تڑپاتے رہیں گے مگر عنصر آخر کا مرثیہ لکھنے کے لئے مصور غم کا سا دل مصور غم کی سی زبان مصور غم کا سا قلم کون لائے گا! اس کتاب میں یہ مرثیہ نقل کرتے وقت ان الفاظ کو جلی لکھوایا جاتا ہے جو گو حضرت علامہ مغفور نے اپنے دوستوں کے لئے لکھے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی الفاظ خود علامہ مغفور کے دیکھنے والوں، ملنے والوں اور جاننے والوں کی زبان سے نکل رہے ہیں!

آہ حضرت علامہ مغفور کی اس آرزو کی تکمیل میں کہ "اگر وہاں بھی صحبتیں گرم ہیں تو خدا مجھکو بھی وہ سماں جلد دکھائے" اور بعد الموت "نہیں بچھڑی ہوئی صورتیں آنکھ کے سامنے" ہوں کچھ زیادہ وقت نہ لگا اور ڈیڑھ سال بھی نہ گذرا تھا کہ وہ نورانی صورت بچھڑ کر ان ہی مٹی ہوئی صورتوں میں مل گئی۔

رازق الخیری

ایک مغربی فلاسفر کی رائے کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے انسان ایسے پیدا ہوئے ہیں جو قدرت سے بیش بہا دل و دماغ لیکر آئے۔ مگر کشاکش حیات نے ان کو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے جوہر ظاہر کرتے۔ ویسٹ منسٹر ایبے West minster Abbey کی خاک جہاں اپنے ابدی نیند سونیوالوں کی شہرت کو چار چاند لگا رہی ہے وہیں کچھ ایسی ہڈیاں بھی اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے جو اسی اصول کا شکار ہوئے اور جس قدر دانی کے وہ مستحق تھے وہ میسر نہ ہوسکی یہ پھر بھی خوش نصیب تھے کہ ان میں سے دوچار یا ایک آدھ کو ایبے میں جگہ مل گئی۔ مگر ہزار ہا ہستیاں جو مختلف

قاری بھی بچھڑ گیا!

دلی مدتیں ہوئیں کہ کبھی گذری ہوئی، خزانِ چمنستانِ ادب کے ایک ایک پھول کو چُن چُن کر لے گئی۔ جو دو چار پھول محفوظ تھے وہ باغبان کی نذر ہو گئے۔

آہ! قاری جو ہماری مجلسِ شباب کی شمع تاباں تھی گو اُس کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی، مگر اُس کو دیکھ کر آنکھیں دو آنسو گرا لیتی تھیں، اب وہ بھی خاک میں چھُپ گئی۔

قاری سرفراز حسین میرے بچپن کے دوست تھے۔ دماغ اور زبان دو چیزیں خدا نے اُن کو بے مثل دی تھیں، جو عمر کے آخر حصہ میں فالج کی نذر ہو گئیں۔ مرنے سے ایک ہفتہ پہلے میں مرحوم سے ملنے گیا، اور میر تجوید کا ایک شعر سُنایا۔ دیر تک لطف لیتے رہے۔ زبان اچھی طرح نہ اٹھتی تھی، مگر میں سمجھتا ہوں میرا یہ آخری تحفہ قاری صاحب کو بعد الموت بھی یاد رہے گا ؎

مری ہستی سے رونق مٹ رہی ہے بزمِ دنیا کی
چراغِ صبح ہوں اے شمع کیوں روتی ہے تو مجھکو؟

خدا اپنی رحمت کے پھول اُن کی قبر پر برسائے۔

"ساقی" جولائی ۳۴ء



(۴) شہزادہ مرزا محمد اشرف گورگانی مرحوم (۳) قاری سرفراز حسین مرحوم (۲) مولوی اشرف حسین مرحوم (۱) علاّمہ راشد الخیری مرحوم

قبرستانوں میں پیوندِ خاک ہیں اور جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا اپنی زندگی میں لیاگرانقدر تخیل کی مالک رہی ہیں کہ اگر وقت اُن کا ساتھ دیتا تو ان کی قبریں بقائے دوام کی سیجوں سے بنی ہوئی ہوتیں۔

آج تقریباً بیس سال کے بعد میرے عزیز بھتیجے میاں شاہ سلمہٗ نے مجھے وہ تصویر دکھائی جسے دیتیں ہوئیں ہیں بھول بسر چکا تھا۔ اس تصویر نے جو اس مضمون کے ساتھ شائع ہورہی ہے مجھے اُن بچھڑے ہوئے دوستوں کی یاد دلادی جو سب ایک ایک کرکے اُٹھ چکے ہیں۔ اس فوٹو میں تصویر نمبر۱ میری ہے، دوسری تصویر میرے عزیز پھوپی زاد بھائی مولوی اشرف حسین مرحوم کی ہے۔ تیسری تصویر نمبر۳ سرفراز حسین مرحوم کی ہے۔ اور چوتھی مرزا محمد اشرف مرحوم گورگانی کی۔

مولوی اشرف حسین

مولوی اشرف حسین مرحوم جو میری گود میں بیٹھے ہوئے ہیں مجھ سے عمر میں پانچ یا چھ سال بڑے تھے اور حق یہ ہے کہ قدرت نے جو دماغ اُن کو دیا تھا وہ ہر اعتبار سے بے مثل تھا۔ مدرسے میں اُن کے اُستاد مولانا حالی اور خواجہ شہاب الدین دونوں اُن کی قابلیت کے معترف رہے، کالج میں لفٹنٹ صاحب نے اپنی تقریروں میں بارہا اُن کی ذہانت کا ذکر کیا۔ اگر زمانہ مساعدت کرتا تو یقیناً اس بلبلِ خوش نوا کی چہکار تمام ہندوستان کو مسحور کرتی۔ اُن کے مزاج میں جس قدر سنجیدگی تھی اُسی قدر ظرافت، اور سب سے زیادہ قابلِ رشک یہ چیز تھی کہ ان کی ہر حیثیت ایک سے ایک ارفع و اعلیٰ تھی۔ شفیق باپ، سعادتمند بیٹا، عزیز بھائی، محبوب شوہر، قابلِ قدر عزیز، اور بے مثل دوست!

اُن کی ملازمت محکمۂ زراعت کی انسپکٹری سے شروع ہوئی مگر اُن کی صداقت ترقی کے راستے میں زنجیر بن کر اُن کے پاؤں میں پڑی اور دنیا کے اس میدان میں جہاں اُن کے ادنیٰ شاگرد سرپٹ دوڑتے ہوئے ڈپٹی کلکٹری تک پہونچے، وہ ترقی کی طرف ایک

قدم بھی نہ اٹھا سکے۔

میرے انتہائی اصرار پر انہوں نے مخزن، تمدن اور عصمت میں کئی مضمون لکھے۔ ایک مضمون جس کا عنوان "حصار فاختہ" تھا مجھے اب تک یاد ہے اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ گراموفون جیسے خشک مضمون میں انہوں نے ایسی ظرافت پیدا کردی تھی کہ مخزن کے دورِ اولین کے پڑھنے والے (جب اس کو میں ایڈٹ کر رہا تھا) پھڑک اٹھے تھے

میں عربک اسکول کی آٹھویں جماعت میں تھا، قاری سرفراز حسین انٹرنس میں مولوی اشرف حسین اور مرزا محمد اشرف بی۔اے میں یہ وہ وقت تھا کہ مدرسہ سے فارغ ہونے بعد رات کے دس دس گیارہ گیارہ بجے تک ہم چاروں اپنا وقت ایک ہی جگہ یعنی مولوی اشرف حسین کے پاس گذارتے تھے۔ انفراغِ تعلیم کے بعد دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں مشکل سے سات گھنٹوں کے لئے جدا ہوتے تھے۔ ورنہ ہماری چوکڑی تھی اور سیر و تفریح کے مشاغل! اُس زمانے میں بہت کم شریف گھر ایسے تھے جہاں اکھاڑہ نہ ہو۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی اکھاڑہ موجود تھا اور ہم لوگ دو ڈھائی گھنٹے کسرت اور لڑنت کیا کرتے تھے۔ یہاں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ہمارے اُستاد ایک صاحب میر محفوظ علی تھے، جو شاید ایف اے پاس کر چکے تھے۔ اور عربک اسکول میں ان کو ملازمت بھی مل گئی تھی۔ اُنہوں نے ایک ہی ہفتہ لڑکوں کو پڑھایا تھا کہ چھٹی کے گھنٹے میں خاموشی سے کشتی سکھانی بھی شروع کردی۔ وہ ایک روز ایک لڑکے کو "دودستی" سکھا رہے تھے کہ اُس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اس کے باپ ماسٹر شہاب الدین کے پاس روتے ہوئے آئے انہوں نے میر محفوظ علی کو بُلایا تو وہ اپنے ساتھ استعفیٰ بھی لے گئے اور کہنے لگے "کہ گو اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ مگر یہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ سبق بھول جائے لیکن دودستی عمر بھر نہ بھولے گا۔"

کس کس کے اب جنتی ہونے کی دعا کروں اور "خدا بخشے" کہے جاؤں۔ اس

گنوار بنا اور مانع کیا جانے۔ یہ جناب کی ہی عنایت ہے، آپ فرمائیے!"

خیر یہ بیچ کی باتیں ہیں جو یاد آرہی ہیں۔ مولوی اشرف حسین مرحوم نے میری درخواست منظور نہیں کی اور میں دوسرے دن نہ گیا۔ ایک دن اور ایک رات اسی طرح گذری تیسرے دن انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "تم خفا ہو گئے، اچھا میں لکھ دوں گا" چنانچہ انہوں نے ایسا دیباچہ لکھا کہ جو پڑھ چکے ہیں انہی کے دل جانتے ہوں گے کہ مثنوی سحرالبیان کیا چیز ہے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں:—

.... کچھ ایسی قوتِ جاذبہ خدا نے دی تھی کہ قلبِ انسانی کا پورا مرقع دل میں اتر آیا تھا مثلاً بدرِ منیر کے حالِ تباہ کی تفصیل میں فرماتے ہیں:—

ولے اُن درختوں میں جن میں وہ ماہ — سرِ شام چھپ چھپ کے کرتا نگاہ
سو وہ بھی پہر دن سے آ واں مدام — اسی چھاؤں میں بیٹھ رہتی تھی شام

یعنی جہاں شاہزادہ پہلے دن اتفاق سے نظر آگیا تھا وہیں جا جا کے بیٹھا کرتی تھی عشق کی آفت سے خدا بچائے محبت اور ماننا میں کیا یہ نوبت نہیں پہنچ جاتی تین چار برس کا کھیلتا اتنا بولتا چالتا بچہ جاتا رہے تو ماں باپ کو دنوں تک یہی آس رہتی ہے کہ شاید اس کونے سے نکل آئے اُس در میں کھڑا ہو نظر آجائے، ٹوٹے پھوٹے کھلونے، پرانی جوتی، میلے کپڑے تک عزیز ہوتے ہیں۔ یہ حالت اکثر آدمیوں پر گذری ہوگی لیکن انتخاب کر کے معرضِ بیان میں لانا میر حسن ہی کا کام تھا۔

اسی عالمِ بےخودی میں استغراق کی کیفیت ہے:—

کہا گر کسی نے کہ "بی بی چلو" — تو اُٹھتا اُسے کہہ کے "ہاں جی چلو"

پہلے مصرع میں طرزِ خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ دیر تک بے جگہ بیٹھے ہوئے دیکھ کر کسی خواص نے وہاں سے چلنے کی درخواست کی جواب نہ ملا تو مخاطب کر کے پھر کہا۔

دوسرے مصرع میں لفظ "ہاں جی" سے صاف ظاہر ہے کہ شاہزادی نے سُن تو پہلے بھی لیا تھا لیکن توجہ نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا شعر اس سے بھی گہرا ہے:—

کہا گر کسی نے کہ "کچھ کھائیے" — کہا "خیر بہتر ہے منگوائیے"

حالت تو یہ ہے کہ بھوک کا کوسوں پتہ نہیں۔ نوالہ منہ میں گولی بن کے رہ جاتا ہے۔ پانی تک حلق میں پھنستا ہے۔ لیکن کھانا کھانے سے انکار نہ کیا۔ کیا کرے کس کس کو اپنا کلیجہ کھول کے

مضمون کے پڑھنے والوں میں جو اہلِ دل ہوں، شاید وہ سمجھیں گے کہ اس کے لکھتے وقت جب وہ صحبتیں میری آنکھوں کے سامنے آرہی ہیں میرے دل کی کیا کیفیت ہوگی، وہ دن اور وہ راتیں ختم ہوچکیں اب نہ وہ آفتاب طلوع ہوگا نہ وہ چاند چمکے گا۔

گرمیوں کے دن ہیں' قدم شریف کے ادھر ایک ٹوٹی ہوئی مسجد میں ہم چاروں بیٹھے ہوئے ہیں' "سحر البیان" اور "گلزار نسیم" پر بحث ہورہی ہے، گنبد کے کلس پر چیل بیٹھی ہے، مرزا محمد اشرف فرماتے ہیں "لاں! کلس پر تو دیکھو دلن دہاڑے بھوت آ موجود ہوا" قاری سرفراز حسین نے کیسی پرلطف بات کہی' فرماتے ہیں "مرزا یار تم بھی جب بولتے ہو بونگی ہی بولتے ہو، محلے کے مدت سے ملاجی کو پریشان کرتے ہوں گے، بچارے چلتے وقت کلس پر ڈول لٹکا گئے ہیں"۔

ذکر مولوی اشرف حسین کا تھا' یہ دونوں باتیں اتفاق سے یاد آگئیں' میں نے اُن سے درخواست کی کہ میر حسن کی مثنوی کو ایڈٹ کردیں۔ وہ لکھنے کے چور نہیں تھے مگر اُن کا مذاق اس قدر بلند تھا کہ مولانا حالی اپنے اُستاد کی بابت بھی اُن کی رائے یہ تھی کہ شعر جتنا اچھا سمجھتے ہیں اُتنا اچھا کہتے نہیں۔ ایک اور لطیفہ یاد آگیا' مولانا حالی میٹرک کلاس کو فارسی پڑھا رہے ہیں' رہتک کا ایک سیدھا سادھا طالب علم قاری سرفراز حسین کے برابر بیٹھا ہوا ہے۔ لڑکے باری باری پڑھ رہے ہیں اور اُس کا نمبر آیا ہی چاہتا ہے۔ یہ یاد نہیں کہ کونسی کتاب تھی مگر یہ فقرہ یاد ہے "سر بیچ بمنی داشت" اُس طالب علم کی جو شامت آئی تو اُس نے قاری جی سے اس فقرے کو پوچھ لیا کہ یہ کیا ہے۔ قاری صاحب نے "سر بیچ بمنی" کو "سیر بیچ بمنی" بتایا۔ بمنا ایک قسم کا کبوتر ہوتا ہے، رہتک والے بچارے طالب علم کو کیا خبر کہ بمنا کسے کہتے ہیں' وہ اسی طرح پڑھ گیا۔ مولانا حالی نے فرمایا "خوب ایا نشاء اللہ پھر فرمایئے!" اس کے بعد مولانا کی نظر قاری پر پڑی اور وہ سمجھ گئے۔ انہوں نے قاری سے کہا "بھلا یہ غریب

اٹھائیں۔ اُن کی پنشن سو روپے کے قریب تھی اور شاید اتنا ہی یا اس سے کچھ کم بیگم صاحبہ کا بھی کرایہ تھا لیکن کبھی انہوں نے ان کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر صرف کرنا جائز نہ سمجھا۔ ان کو اس سے بھی زیادہ رنج تھا کہ ان کے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر اجمل حسین کا کوئی پیسہ اُن کے کام آئے۔ موسیقی میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا، کبڈی اچھی اور کرکٹ بہت اچھا کھیلتے تھے۔ تیرنا ہم سب سے اچھا جانتے تھے اور نظم کی ترمیم تو ایسی کرتے تھے کہ سبحان اللہ۔ مرزا دبیر کا ایک مشہور مرثیہ ہے "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے"

اس مرثیے میں ایک بند ہے :-

بل دولہا و بیرق کو سکتہ ہوا ڈر سے | اک بار گرا تاج ہما شاہوں کے سر سے
خنجر گرے کھل کھل کے شجاعوں کی کمر سے | تاب ہوئے مریخ و زحل فتنہ و شر سے

افسوس ہے کہ مرزا صاحب کا ٹیپ کا بند مجھے یاد نہیں۔ مولانا اس بند کی ترمیم میں فرماتے ہیں :-

طبلے بجے، دولہا بھی ڈبے ہوئے ڈر سے | ایک بار گرا تاج ہمایوں کے جو سر سے
باہر جو پکارا کہ نکالو اسے گھر سے | دلہے جو سنا باندھ دو پٹے کو کمر سے
کس زور سے دونوں نے وہاں پنجہ کیا ہے | شیطان نے گویا کہ قدم رنجہ کیا ہے

افسوس ہے کہ بزمِ اربعین کی یہ شمعِ تاباں جس کی روشنی سے بہت کچھ توقع تھی جل جل کر بجھ گئی اور اس کے ساتھ ہی ہماری صحبت کا خاتمہ ہوا اور آج وہ بلبلِ ہزار داستان جو مولانا اشرف حسین کے جسدِ خاکی میں کام کر رہی تھی خواجہ باقی باللہ کی درگاہ میں زندگی کے جھگڑوں سے چھوٹ کر میٹھی نیند سو رہی ہے۔

قاری سرفراز حسین

قاری صاحب کو قدرت نے عجیب دماغ عطا فرمایا تھا۔ وہ جس جگہ نکل جاتے تھے لوگ اُن کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ایسا لطیفہ گو، بذلہ سنج اور حاضر جواب آدمی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اُن میں ایک خاص نکتہ یہ تھا کہ روتے آدمی کو ہنسا دیتے تھے اور اُن کی باتوں سے مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ میں اوپر ان کے دو ایک لطیفے لکھ چکا ہوں۔ ایک لطیفہ مجھے انکا اس وقت اور یاد آیا ہے۔ جس شادی کی یہ تصویر کھنچ رہی ہے، اُسی شادی میں مرزا محمد اشرف جن کے بال جوانی میں سفید ہونے شروع ہو گئے تھے، خضاب لگائے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب کی داڑھی بڑی تھی اور مہندی اور وسمہ کے اوپر شاید ڈھاک کے پتے کم ہو گئے ہوں گے یا محض اتفاق تھا کہ ڈھاٹے کے چاروں طرف روئی نکلی ہوئی تھی۔ اس لطیفے کا مزا دلی والوں

دکھائے۔ اگر انکار کرتی ہو تو خواصیں اور پیچھے پڑتی ہیں۔ ایک کہتی ہے بی ہوش میں آؤ اپنا دل ٹھکانے کرو۔ لو اور سنو کھانا بھی کہیں چھٹ سکتا ہو۔ دوسری کہتی ہو بیگم تم نے کیوں اپنی بھلی چنگی جان کو عذاب لگایا۔ خبر ہے وہ اپنے کہاں چین کرتا ہوگا۔ دوسری کچھ دور ہی سے حاشیہ لگاتی ہے اے کمبخت مردوں کی ذات سدا ہی سے بیوفا ہے۔ ان جگر خراش طعنوں سے بی کھسیانا ہوتا ہو سلسلۂ خیال الگ درہم ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مرحوم کو شہرت سے اس قدر بیزاری تھی کہ وہ اپنے نام کی اشاعت بھی آسانی سے گوارا نہیں کرتے تھے۔ ایک موقع پر دہلی میں ایک انجمن کا سالانہ جلسہ تھا میں نے ان سے کہا کہ کوئی نظم لکھیے۔ انہوں نے میری خواہش تو پوری کردی مگر یہ شرط لگادی کہ میرا نام نہ آنے پائے جب اس نظم کے پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی تو میں نے اس نظم کو ان ہی کے نام سے شائع کرنا چاہا لیکن انہوں نے اس کو بھی پسند نہیں کیا۔ اس کے چند شعر مجھ کو یاد ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ ان کا فلسفیانہ تخیل کس قدر بلند تھا اور اگر وہ شعر کہتے تو کیا کہتے چند اشعار یہ ہیں:

گلشنِ شاداب میں موجود ہیں جو جو شجر — کوہ و صحرا میں بھی آتے ہیں وہی اکثر نظر
فرق یہ ہے واں درختوں کی بقاو پرورش — منحصر ہوتی ہے مطلق فطرتی اسباب پر
گر زمیں کی قوت روئیدگی کچھ گھٹ گئی — کوئی سوکھا جڑ سے اور رہ گیا کوئی ٹھٹھر
باغ میں ان آفتوں کے دفع کرنے کے لیے — کوششیں ہر قسم کی ہوتی ہیں تا حدِ بشر
کھود، پانی، سایہ، چشکی، سلسلہ ترتیب فصل — (دوسرا مصرعہ یاد نہیں)

ان کے مزاج میں ظرافت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ قاری سرفراز حسین میں جو کچھ جولانی اور ذہانت موجود تھی انہیں مولوی اشرف حسین مرحوم کی صحبت کو بڑا دخل تھا۔ ایک موقع پر ہم سب ایک عزیز کے ہاں ملنے گئے۔ ان کی بیوی اس وقت سر گوندھ رہی تھیں اور چوٹی کے دونوں حصے موباف میں لپیٹے ہوئے ان کے منہ میں تھے۔ چونکہ ان عزیز سے مذاق ہوتا تھا اس لئے انکی بیوی کو سب فاختہ فاختہ کہتے تھے۔ قاری نے ان کے شوہر سے پوچھا بھائی! تمہاری بیوی کا نام کیا ہو؟ یہ ملحوظ رہے کہ چٹیا کے دونوں حصے ان کے منہ میں ہیں، مولانا مرحوم فرماتے ہیں "دمڑی کا باجرہ لاکر ان کی بیوی کے آگے جن کا نام پوچھ رہے ہو ڈال دو چن لیا تو ٹوٹرو نہیں بارہ سنگا تو ہے ہی" وہ اسقدر غیور طبیعت لیکر آئے تھے کہ انہوں نے ہر عزیز، ہر دوست اور ہر آشنا پر احسان کیا مگر یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ خود کسی کا احسان

مولوی اشرف حسین مرحوم پان کے بہت شائق تھے اور بہت تکلف سے کھاتے تھے۔ برخلاف اس کے مرزا محمد اشرف بہت ہی کم کھاتے تھے بلکہ کھاتے ہی نہ تھے۔ اب مرزا صاحب کا سنجیدہ مذاق ملاحظہ فرمایئے چھٹی پر آئے ہوئے تھے مولوی اشرف حسین سے ملنے آئے میں اور قاری سرفراز حسین بھی بیٹھے تھے۔ ملا پان اور حقہ لائی۔ مرزا صاحب نے مولانا کو ستانے یا جلانے کی یہ تجویز سوچی کہ خاصدان میں سے پان نکالکر بغیر چھالیہ ڈالے ذرا ذرا سا کترنا شروع کیا۔ جب آدھے کے قریب پان کتر چکے اور آدھا ان کے ہاتھ میں رہ گیا تو مولانا نے خاصدان اُن کے سامنے کردیا کہ اُن سب کو بھی کُتر کر آدھا کردیجئے کیونکہ جنت میں تو پان ہونے کے ہی نہیں۔

مرزا مرچکے ہیں اور قاری بھی رخصت ہوگئے۔ خدا معلوم اُن دونوں کی وہاں کیسی رہی ہوگی۔ اگر وہاں بھی یہ صحبتیں گرم نہیں تو خدا مجھکو بھی وہ سماں جلد دکھائے۔ مرزا نے باقی کا آدھا پان بھی کترنا شروع کیا۔ اس کے بعد قاری نے مرزا سے جو کچھ کہا وہ جوانی کی باتیں تھیں آج بڑھاپے میں ان کا اعادہ جگر خراش ہوگا۔

مرنے سے پہلے مرزا صاحب کچھ روز کے لئے دہلی آئے تھے اور مولوی اشرف حسین انکے پاس اکثر جاتے تھے، برسات کا موسم تھا اور یہ وہ دن تھا جس روز ڈاکٹر مرزا کو قریب قریب جواب دے چکے تھے۔ لنگڑے آم پانی میں بھیگے ہوئے تھے اور مرزا کے عزیز بے تکلفی سے آم کاٹ رہے تھے اور کھا رہے تھے۔ مرزا نے میری اور بھائی اشرف حسین کی طرف دیکھکر کہا "دیکھئے! جس وقت میری زندگی کا تماشہ ختم ہو رہا ہے، اس وقت یہ عزیز آموں کا لطف اٹھاتے ہوئے مجھے رخصت کر رہے ہیں"۔ مرزا کے الفاظ اس قدر موثر تھے کہ میرے اور بھائی اشرف حسین دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس طرح ہم نے اس تصویر کے ایک عنصر کو خدا حافظ کہا جو آج بے پور میں پیوند زمیں ہے۔

میرے شباب کی آنکھوں نے خاک جہاں آباد پر جو جو مجلسیں منعقد ہوتیں اور اجڑتی دیکھی ہیں اُن کے خیال سے کلیجہ پر سانپ لوٹتا ہے۔ میں نے جس وقت آنکھ کھولی ہے تو اس حسینہ کی آنکھیں مُنچ چکی تھیں اور غدر ۱۸۵۷ء کے ہاتھوں اس کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ افلاس کی مصیبت اس کی بہار کو داغ داغ کر رہی تھی اور حُسن نگار دم توڑ رہا تھا۔ رنگ حنا اُتر چکا تھا، مستی کی دھڑی اڑ رہی تھی، پھر بھی اس کی رگ رگ عطر محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کو زیادہ آئیگا بالخصوص اُنکو جنہوں نے عید بقرعید کے موقعوں پر چیپے کا لنگو۔ دیکھا ہوگا جسکا منہ کالا ہوتا ہے اور ذرا سی سفید روئی ٹھوڑی پر لگی ہوتی ہے۔ مرزا صاحب ہماری اطلاع ہوتے ہی ایک تہمد باندھے ننگے دھڑ ننگے باہر نکل آئے۔ قاری کیا چوکنے والے بشر تھے مجھ فرمانے لگے "کیوں بھئی اسی لنگور کی شادی ہو رہی ہے" میری اور بھائی اشرف حسین کی ہنستے ہنستے بری حالت ہو رہی تھی۔ ان مرنے والوں کی داستانیں کس طرح دہراؤں۔ ایک طرف اُن کی قابلیت بےمثیل تھی۔ دوسری طرف اُنکی ظرافت لاجواب! قاری سرفراز حسین کا ایک اور لطیفہ بیان کرنے کے قابل ہے اُن کے بڑے لڑکے قاری عباس حسین کی تقریب ختنہ تھی۔ گھر سے جب دونو صبح نکلے ہیں تو اُن کی والدہ نے کہدیا تھا کہ آج بچے کی مسلمانیاں ہیں دو بجے آجانا۔ دن بھر ہم سب محلدار خاں باغ میں رہے۔ اُس روز غالب اور ذوق پر بحث تھی۔ رات کو آٹھ نو بجے کھانے سے فارغ ہو کر جب ہم باہر نکلے تو دس بجے کے قریب دفعتاً قاری صاحب کو خیال آیا اور کہنے لگے" ارہوا مجھے یاد ہی نہیں رہا آج عباس کی مسلمانیاں تھیں اب جا کر کیا کروں گا۔"

قاری سرفراز حسین نے مذہب کی اچھی خدمت کی ہے، ان کی تصانیف کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں، مجھے اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان کی عمر کا آخری حصہ ایک نکاح کیوجہ سے اچھا نہ گذرا اور زندگی کے وہ دن جب وہ بہت کچھ کام کر سکتے تھے رنج و فکر میں ختم ہو گئے۔ قاری جی کو مرے ہوئے چند ہی روز ہوتے ہیں وہ شخص جس نے رنج نہیں۔ ۔ ۔ دموں میں روتوں کو ہنسایا دنیا سے رخصت ہو کر خواجہ باقی باللہؒ میں دفن ہو گیا۔

شہزادہ مرزا محمد اشرف گورگانی بی اے

مرزا بہت سیدھے سادے آدمی تھے نہ سہیت

شروع ہی سے اُن کی طبیعت میں موجود تھی، اسی وجہ سے (خدا دونوں کو غریق رحمت کرے) قاری کے دلبے بنے رہتے تھے "بیوے" وغیرہ کا قصہ جو کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے انہی کا مینہ ہے ان کی سب سے آخری تصنیف کے کچھ اوراق بہاولپور کے کسی رسالے میں دیکھے تھے! میاں مشتاق زاہدی نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ غالباً یہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس کا نام "شاما شامی" ہے اگر میرا خیال درست ہے تو کتاب بہت خوب ہے اور میری رائے میں اُن کے بیٹے میاں مصطفٰے اشرف کا جو شاید بہاولپور میں تعینات ہیں، فرض ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس کتاب کو شائع کر دیں۔

مصوّرِ غم

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) شاہجہاں آباد کے اُس مقتدر اور ممتاز خاندان کے فرزند رشید تھے جسے خاندان شاہانِ مغلیہ کے اُستاد ہونے کا نسلاً بعد نسلاً فخر حاصل رہا۔ جس نے مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم اور ہندوستان کے مشہور سحر البیان مولوی عبدالرب مغفور بانی جامع مسجد سہارنپور جیسے جیّد علماء اور قرآن و حدیث کے نامور ماہرین پیدا کئے۔ یہ اجڑے دیار کا وہ نامور خاندان تھا جس کی بیٹیاں حافظہ حاجیہ قاریہ ام عطیۃ النسا مرحومہ (چھوٹی استانی جی) اور حاجیہ ام ذکیہ مرحومہ جیسی مشہور عالمہ فاضلہ خواتین اور جس کے داماد شمس العلماء مولوی نذیر حسین مرحوم "محدث دہلی" اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم جیسے نامور بزرگ تھے۔ حضرت علامہ مغفور بمقام دہلی جنوری ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے، اور ابھی نو دس برس ہی کے تھے کہ ان کے والد ماجد مولوی حافظ عبدالواجد صاحب نے حیدر آباد دکن میں جہاں وہ محکمۂ بندوبست میں افسرِ اعلیٰ تھے، انتقال فرمایا، اور حضرت علامہ مرحوم کی تعلیم و تربیت ان کے دادا اور چچا حضرت مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم اور خان بہادر مولوی عبدالحامد صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں ہونے لگی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے۔ اس لئے حضرت علامہ مغفور نے اُردو فارسی عربی وغیرہ گھر پر پڑھی۔ پھر انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں ہوئی۔ مگر انہوں نے اپنے شوق سے اسے بہت کچھ ترقی دی۔ مولوی نذیر احمد مرحوم (جو علامہ مرحوم کے حقیقی پھوپا تھے) اور مولانا حالی مرحوم کی شاگردی نے علامہ مغفور کی قابلیت کی ترقی میں چار چاند لگا دیئے۔ ابھی حضرت علامہ انٹرنس ہی میں تھے کہ ان کی ذہانت کا چرچا ہونے لگا۔

تکمیل تعلیم کے بعد مولوی عبدالرحیم صاحب بانی جامع مسجد جھجر کی اکلوتی صاحبزادی سے جنوری ۱۸۹۰ء میں شادی ہوئی۔ اور ۱۸۹۱ء میں محکمۂ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازمت شروع کی۔ مگر ملازمت کی پابندی حضرت علامہ کی طبیعت

اس چمن کے چپے چپے پر اپنے تختے کھل رہے تھے جو اس وقت بھی بقائے دوام سے آراستہ ہیں۔ یہ دلی کے وہ باکمال تھے جنکی خاموشی پر سینکڑوں زبانیں اور جن کی نہ بولنے پر ہزاروں تانیں قرباں! انہیں خبر نہ تھی کہ یہ پھول سے کھڑے جنکی زندگی کائنات کو درس فنا دے رہی ہے، آنکھوں سے ایسے چھپینگے کہ اُن کی یاد دماغ بن کر کلیجے کو تڑپائے گی اور یہ چمن جسکے چہکنے والے طائران خوش الحان ایک دنیا کو مسخر کر رہے ہیں، ایسا تباہ ہوگا کہ دنیا اسکی جھلک کو ترسے گی۔ یہ راتیں جو بیت رہی ہیں اور یہ دن جو گذر رہے ہیں اب دوبارہ دیکھنے نصیب نہ ہوں گے، اس چمنستان اور ان گلچیروں کی یاد مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا جنکا تختہ تک کو محتاج ہوگا

عشاء رابعہ کی تین صورتیں پیوند زمین ہوگئیں۔ اور ان کو رونے والا ایک میں زندہ ہوں۔ جب صحبت شب کا سماں آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو دیوانہ وار ہر سمت ڈھونڈھتا ہوں، مگر آہ! مرجھائے پھولوں کی پتیاں اور جلی ہوئی شمع کی خاک کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ خوش نصیب تھیں وہ فنا ہوجانے والی، اور مٹنے والی صورتیں کہ رونے کو دو آنکھیں اور تڑپنے کو ایک دل چھوڑ گئیں۔ اور عالم خیال اُن کی یاد پر آنسوؤں کے چند پھول چڑھا رہا ہے، میں اس سے بھی محروم ہوں، روؤں گا جب تک زندہ ہوں اور بلبلاؤں گا جب تک دماغ صحیح ہے۔

رات کی تنہائی میں جب عابد روزہ دار درگاہ رب العزت میں مغفرت کی دعا کرتا ہے میں بھی اُسی دربار میں یہ التجا کرتا ہوں کہ حور و غلماں کے بدلے قصر زمردیں اور جنت الفردوس کی بجائے یہی دن اور رات، یہی آرزوئیں اور جذبات ہوں۔

اور یہی بچھڑی ہوئی صورتیں آنکھوں کے سامنے!

ستمبر ۱۹۳۴ء

۱۹۲۰ء میں نیشنل یونیورسٹی نے سب سے پہلا اُردو ممتحن مقرر کیا۔ ۱۹۲۷ء میں حکومت بہار واڑیسہ نے شمالی ہند سے بہ حیثیت ماہر اُردو کے اُردو ہندی کی ترقی کے سلسلے میں حضرت علامہ مرحوم سے بیش بہا مشورے لئے۔

۱۹۲۲ء میں مسلمان بچیوں کے لئے تربیت گاہ بنات قائم کی جس سے ہندوستان کے مختلف حصوں کی سینکڑوں خوشحال اور یتیم و نادار بچیوں نے حیثیت بورڈر تعلیم و تربیت حاصل کی اور جس سے ہزاروں غریب کم استطاعت بچیاں زیور تعلیم سے آراستہ ہوئیں اس مدرسہ کیلئے بیگم صاحبہ محترمہ کے ساتھ علامہ مغفور باوجود پیرانہ سالی کے ہندوستان کے کسی صوبہ کا سال میں مہینہ سوا مہینہ کا دورہ فرماتے تھے۔ مدرسہ کے کاموں میں محترمہ بیگم راشد الخیری صاحبہ حضرت علامہ مرحوم کی برابر کی شریک رہیں۔ ۱۹۰۸ء میں مسلمان بچیوں کے لئے رسالہ "بنات" جاری فرمایا ۱۹۳۴ء میں علامہ مغفور کی مرحومہ بہو محترمہ خاتون اکرم کی یادگار میں زنانہ دستکاری کا رسالہ "جوہر نسواں" جاری ہوا۔ حضرت علامہ راشد الخیری کی (خدا انہیں غریق رحمت فرمائے) خودداری بڑے آدمیوں اور بااثر و بارسوخ لوگوں سے سے ملنے کو کبھی درست نہ سمجھتی تھی نام و نمود شہرت وخود ستائی جلسوں اور بے نتیجہ تقریروں سے سخت نفرت تھی۔ کسی جلسہ یا کسی تحریک میں حصہ نہ لیتے تھے حضرت مصور غم نے خاموشی کے ساتھ مسلسل چالیس سال تک تصانیف اور رسالوں کے ذریعہ خواتین ہند اور ادب اُردو کی جو زبردست شاندار خدمات انجام دیں وہ اس قدر گراں بہا اور عظیم الشان ہیں کہ مشہور ادیبوں اور رہنمایان قوم کا فیصلہ ہے کہ ان کی نظیر نہیں نکل سکتی۔ اصلاح نسواں اور حقوق نسواں کیلئے حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کی کوششیں کبھی فراموش نہ ہوسکیں گی۔ مصور غم ہی کی تحریروں سے عورتوں کی مظلومیت پر مردوں کے پسیجے۔ مصور غم ہی کے لٹریچر سے عورتوں کو اپنی اصلاح و ترقی کا احساس پیدا ہوگیا۔ گذشتہ تہائی صدی میں خواتین ہند میں جو تھوڑی بہت بیداری پیدا ہوئی ہے متفقہ طور پر اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اسمیں بہت بڑا حصہ جنت نصیب حضرت علامہ راشد الخیری کی ان تھک مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے۔ حضرت مصور غم علیہ الرحمۃ مشرق کے بےمثل حزن نگار مصنف ہی نہ تھے۔ مزاحیہ مضامین لکھنے میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ناولسٹ بھی تھے، جرنلسٹ بھی، مختصر افسانہ نگار بھی تھے، اور مورخ بھی شاعر بھی تھے اور انشا پرداز بھی، مگر ہر حیثیت میں مصلح اور نسوانی جذبات کے ترجمان۔ ان کی تحریر کی طرح انکی تقریروں اور لیکچروں میں بھی خدا نے کچھ ایسا اثر اور آواز میں کچھ ایسا درد عطا فرمایا تھا کہ مجمع زار و قطار آنسو بہاتا تھا۔ حضرت علامہ مغفور میں مذہبی عنصر بہت غالب تھا زمانۂ شباب میں

کے خلاف تھی۔ اور دفتر کے خشک کاموں میں جی نہ لگتا۔ پھر علامہ مرحوم کی والدہ مرحومہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی زیادہ روز کے لئے گوارا نہ کرسکتی تھیں۔ ان وجوہ سے جم کر ایک جگہ نوکری نہ کی۔ اور ترقی کے نہایت معقول مواقع میسّر آنے پر ان کی طرف مطلق توجہ نہ فرمائی، اوراناؤ، کھیری، میرٹھ، علی گڈھ، دہرہ دون کی تبدیلی ہوتی رہی آخر دلّی کے پوسٹل آڈٹ آفس میں تبدیل ہوئے مگر چند سال گذرے تھے کہ ۱۹۱۰ء میں اٹھارہ انیس سال کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔

حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے پہلی تصنیف "حیات صالحہ یا صالحات" ہے جو ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی ۱۸۹۸ء میں دوسری تصنیف "منازل السائرہ" ختم کی۔ ان دونوں اصلاحی ناولوں کی اشاعت کے بعد حضرت علامہ مغفور کا شہرہ ایک مقبول پایہ مصنف کی حیثیت سے بلند ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۰۳ء سے رسالہ "مخزن" میں افسانے اور مضامین شائع ہونے لگے پھر "صبح زندگی" شائع ہوئی اور دلّی کے باکمال ادیب کی طرز تحریر کی دلآویزی، زبان کی شیرینی، اور واقعات کے پیرایۂ بیان کی درد انگیزی کی دھوم مچنے لگی۔ ۱۹۰۸ء میں رسالہ "عصمت" جاری ہوا جو ۲۸ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے اور ہندوستان کا بہترین زنانہ پرچہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں حقوق نسواں کی حمایت میں رسالہ "تمدن" جاری کیا جو ۵ سال تک بڑی خوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۹۱۵ء میں اخبار سہیلی جاری فرمایا مگر ۱۹۱۶ء میں دفتر عصمت میں قیامت کی آگ لگی اور سہیلی جاری نہ رہ سکا ۱۹۱۷ء میں "شام زندگی" شائع ہوئی اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ پہلے ہی سال میں تین مرتبہ چھپی اور کتاب نے قوم سے حضرت علامہ مغفور کو مصور غم کا خطاب دلوایا اب اُردو کے بے مثل مصنف نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا اور دو درجن کے قریب ضخیم کتابیں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۳ء تک کے زمانہ میں لکھ ڈالیں جو مختلف حضرات نے شائع کیں۔ اور بقول معز تاجر "لاکھوں روپیہ پیدا کیا" حضرت مصور غم نے اپنی تصانیف کی جو مقبولیت دیکھی شاید اُردو کے کسی مصنف کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ایک دو نہیں درجنوں کتابیں آٹھ آٹھ دس دس سال کے عرصہ میں دس دس بارہ بارہ دفعہ چھپیں۔ بلکہ "صبح زندگی" شام زندگی وغیرہ کے تو پندرہ پندرہ بیس بیس ایڈیشن شائع ہوئے۔ آخری دو کتابیں "آمنہ کا لال" سیدہ کا لال " بھی چار ساڑھے چار سال میں ہزارہا کی تعداد میں پانچ چھ دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں۔

۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اردو کورس علامہ مغفور سے صحیح کرائے۔

فخرِ نسوانِ ہند محترمہ خاتونِ اکرم جنّت مکانی کی یادگار میں

جوہرِ نسواں دہلی

زنانہ دستکاری کا ماہوار رسالہ ۱۹۳۴ء سے جاری ہے

دفتر عصمت دہلی کے اس ماہوار رسالہ میں کشیدہ۔ کروشیا۔ جالی۔ تارکشی۔ کارپٹ۔ کینوس۔ کراس اسٹیچ۔ سلمہ ستارہ۔ ربن پتی۔ گوٹا اور کپڑوں کی سلائی۔ کٹائی وغیرہ وغیرہ مختلف قسم کی زنانہ دستکاریوں کے عمدہ عمدہ نمونے اور مفصل ترکیبیں اور کارآمد ہدایتیں شائع ہوتی ہیں جوہرِ نسواں کے مضامین پھوہڑ لڑکیوں کو بھی سگھڑ اور ہنرمند بنا دیتے ہیں جوہرِ نسواں کی قلمی معاونین ہندوستان کی مشہور دستکار خواتین ہیں اور اڈیٹر مقبول و مشہور کتابوں کی مؤلفات۔ سال میں دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں جو کسی موضوع پر بہترین مستقل کتابیں ہوتی ہیں۔

ٹائیٹل نہایت خوبصورت کاغذ چکنا دبیز لکھائی چھپائی مصوری اعلیٰ درجہ کی۔

سالانہ چندہ۔ مع محصول دو روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ ۴ر

دفترِ عصمت کی کچھ اور کتابیں

سوئی کا کام	عہ؍	ادب زریں	۸ر	افسانہ حرم ۸ر، فیروزہ	۸ر
موتیوں کا کام	عہ؍	نغمات موت	۶ر	آئینہ مولڑ	عہ؍
سلمہ ستارہ کا کام	عمر	خانہ داری کے تجربات	۱۲ر	سنگھار خانہ	عمر
اونی کام سلائیوں سے	عہ؍	مفید نسواں	۸ر	تندرستی ہزار نعمت	۵ر
خواتین کی دستکاریاں	۸ر	جاں باز	۱۲ر	زنانہ لہستہ عہ، شمع خاموش	۶ر
جاپانی کہانیاں	عہ	دامن باغباں	عہ	پردہ و تعلیم	۱۲ر
مزیدار کہانیاں	۵ر	روحانی شادی	۶ر	صنعت و حرفت	عمر
شہید وفا	صہ	آئینہ جمال	۱۲ر	زچہ خانہ	۸ر

(مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

علاوہ مذہب کے فارسی شاعروں اور انگریزی مصنفین کا بھی مطالعہ فرمایا تھا، حافظہ حیرت انگیز تھا۔ موسیقی سے بہت دلچسپی تھی، انگریزی اور ہندوستانی بہت سے کھیل جانتے تھے۔ بدن کسرتی تھا، جسم دوہرا قد لمبا، چہرہ پر دلالت اور نور برستا تھا۔ خانگی زندگی انتہائی کامیاب تھی اور دیکھنے والوں کے لئے ہر حیثیت سے قابل رشک تھی۔ بے نظیر بیٹے، لاجواب بھائی، سعادتمند داماد۔ بہترین شوہر، عاشق زار باپ، اور بہترین دوست ہمیشہ شاداں و خنداں رہتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور زندہ دلی ان کے ملنے والے بھلائے سے بھی نہیں بھول سکتے۔ جن کی قابلیت کا ڈنکا چار کھونٹ ڈنکا بج رہا تھا۔ جن کی شہرت اس دور کے بڑے بڑے مصنفوں اور رہنماؤں کیلئے باعث رشک تھی، جن کا نام عزت کے ساتھ جنکا ذکر محبت کے ساتھ لیا جاتا، اور کیا جاتا تھا، ان کی شرافت اور اخلاق، سادگی اور وضعداری، مہمان نوازی اور انسانی ہمدردی دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈالدیتی تھی۔ ان کی عاجزی اور انکساری کا یہی ثبوت کچھ معمولی نہیں کہ ۷۰ کے قریب کتابیں زندگی میں شائع ہوگئیں لیکن کسی کتاب میں تصویر شائع نہ کرنے دی۔ کسی کتاب کو کسی کے نام منسوب نہ کیا۔ کسی کتاب میں کسی کی تقریظ جائز نہ سمجھی۔ تین چار کتابوں میں دیباچے بھی مجبوراً لکھے ورنہ سوائے ٹائیٹل پر نام آنے کے اپنا نام تک اپنی کتاب میں دوبارہ آنا پسند نہ فرمایا۔ صبر، شکر، توکل، قناعت ہمیشہ شیوہ رہا۔ اپنی حالت میں بے انتہا خوش رہے۔ رحمدلی مخلصانہ عملی ہمدردی، غیروں کی آگ میں کود پڑنا، دوسروں کے لئے سب کچھ لٹا دینا المختصر خدمت خلق اللہ حاصل عمر تھا۔ ۶۸ سال کی عمر تھی اور بظاہر صحت نہایت اچھی کہ دو ماہ بیمار رہ کر ۳ فروری کی منحوس صبح کو اجڑے دیار کے آخری باکمال مصنف کا سایہ قوم بدبخت کے سر سے اٹھ گیا۔ مصور غم کی رحلت پر ہندوستان بھر کے ہر پڑھے لکھے گھرانے میں کہرام مچ گیا جگہ جگہ زنانہ اور مردانہ ماتمی جلسے ہوئے اور ہندوستان کے باہر ادب اردو کا ذوق رکھنے والا شخص دم بخود ہوگیا۔ جس قدر رنج و غم میں ڈوبے ہوئے مضامین جتنے مرثیے نوحے قطعات تاریخ المختصر جس قدر بلند پایہ ماتمی لٹریچر مصور غم کے انتقال پر شائع ہوگیا وہ اتنا زبردست ہے کہ بقول اڈیٹر ملت "کسی ادیب یا رہنما کی وفات پر اسوقت تک شائع نہ ہوسکا" آسمان کتنی ہی کروٹیں بدلے زمین کتنے ہی چکر کاٹے، ہندوستان بدلے، ہندوستان والے بدلیں، معاشرت بدلے، ادب بدلے لیکن مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری کو ہمیشہ عزت و محبت کیسا تھ یاد کیا جائیگا اور انکا نام آنیوالی نسلیں فخر کیساتھ لیتی رہیں گی۔ خدا کی بیشمار رحمتوں کے پھول اس مزار مبارک پر برستے رہیں جس میں وہ میٹھی نیند سو رہے ہیں، اور خدا جنت نعیم میں اس پاک روح کو ابدی سکون عطا فرمائے جسکی دائمی مفارقت میں آٹھ آٹھ آنسو رلا رہی ہے۔

رازق الخیری

۲۲ جولائی ۱۹۳۶ء